مرقعِ فطرت

یعنی

ابتدائے دنیا سے لیکر انسان کے پیدا ہونے تک کی قدرتی داستان!

نیز

یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں مذاہب کیسے پیدا ہوئے؟
اور مذہب انسانیت کیا ہے؟

مصنفہ:-

ڈاکٹر پریم ناتھ

مرقع فطرت

(باتصویر)

یعنی

ابتدائے دنیا سے لیکر انسان کے پیدا ہونے تک کی قدرتی داستان

نیز

یہ بتایا گیا ہے کہ مذہب کا خیال کیسے پیدا ہوا

اور مذہب انسانیت کیا ہے؟

مصنفہ

ڈاکٹر پریم ناتھ

سنہ ۱۹۴۰ء

پیشکش

میں یہ ناچیز تحفہ ملک کے اُن روشن خیال
نوجوانوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جو یہ
محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سیاسی اور
مجلسی انقلاب کے دوش بدوش مذہبی انقلاب
کی بھی ضرورت ہے

پریم ناتھ

محبوب المطابع برقی پریس دہلی

فہرست مضامین "مرقع فطرت"

دیباچہ

دُنیا آج ایک ایسے دَور سے گذر رہی ہے جسے بجا طور پر ذہنی انقلاب کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق نظریات میں ردوبدل اور تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اعتقادات اور توہمات کی بجائے عقل و سائنس کے مشاہدات اور تجربات کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔

گو یہ صحیح ہے کہ انسان کا علم محدود ہے۔ کیونکہ وہ خود محدود ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جہاں تک ہم معلوم کر سکتے ہیں اُسے بھی پورے طور پر نہ جانیں۔ زمانۂ گذشتہ کے بہت سے فلسفیوں اور مذہبی راہنماؤں نے عقلی تجربات اور مشاہدات کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ اور سائنس کی طرف سے اپنی اس لاپرواہی کو شانِ اعجازی سمجھکر اُس پر ناز کیا ہے۔ اسی لئے قدیم مذاہب زیادہ تر توہمات سے پُر ہیں۔ جہاں علم و عقل کو دخل نہیں ہوتا وہاں توہمات کو نشوونما پانے کا خوب موقع ملتا ہے۔ انسانی ترقی کی راہ میں توہمات سب سے بڑی رُکاوٹ ثابت ہوئے ہیں۔ انہی نے ہمیں وحشیانہ جہالت میں پھنسا رکھا ہے۔ بُغض و عِناد اور کُشت و خون کو ترقی دی۔ دماغ کو مُعطل کر کے رُوح کو خوف و جہالت کا شکار بنا یا۔ طرح طرح بے بُنیاد وعدوں اور بے شمار جھوٹی اُمیدوں سے بہلائے رکھا۔ پُجاریوں۔ مُلّاؤں اور دھرم کے ٹھیکیداروں کے ہاتھوں غریبوں کو لٹوایا۔

آج ہمارے سماج میں آزادیٔ فکر کی جگہ اندھی تقلید نے لی ہے۔ جدید غور و فکر کی بجائے پُرانی پوتھیوں پر ایمان رکھنا ہمارا دستور ہے۔ سوچ و چار فطرت کا آزاد مطالعہ بالکل جاتا رہا۔ یہی وہ چیزیں تھیں جن کے باعث کبھی ہمارے بزرگ جملہ علوم و فنون میں اپنے ہمعصروں سے پیش پیش تھے۔ یہی چیزیں جو کبھی ہمارے بزرگوں کی طرۂ امتیاز تھیں۔ اب مغرب میں سائنس کے نام سے نمودار ہوئی ہیں۔ ہم سینکڑوں برس خواب غفلت میں رہے۔ ذہنی غلامی اور اندھی تقلید کا نتیجہ سیاسی اور معاشی غلامی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہم "پدرم سلطان بود" کا وظیفہ رٹتے رہ گئے۔ اور دُنیا کہیں سے کہیں نکل گئی۔ ہماری یہ ذہنیت ہو گئی ہے کہ ہم ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ہمارے بزرگ بھی غلطی کر سکتے تھے۔ ہمارا مذہبی نظام بھی بہت پُرانا اور بے کار ہو گیا ہے۔ یہ ہماری موجودہ ضروریات کو پُورا نہیں کرتا۔ مذہبی ٹھیکیدار ابھی تک اندھی تقلید اور ویراگ کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اُنھیں دُنیا کی ضروریات کی خبر نہیں۔ موجودہ زمانے کے علوم و فنون کی ترقی سے یہ محض ناواقف۔ کیونکہ یہ ہر چیز سے لاعلم ہیں اس لئے تمام دُنیا کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ رواداری اور فراخ دلی سے دُور کے بھی واقف نہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑنا اُن کی عادت ہے۔

ہم نے اس چھوٹی سی کتاب میں اُن چند اعتقادات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جنکا انسان کی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ ہر زمانے میں علم کی ترقی کے مطابق لوگوں کے خیالات بدلتے رہے ہیں۔ وہ خیالات جو پُرازحقیقت ہیں قائم رہے۔ باقی رفتہ رفتہ یاد سے محو ہونے گئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو غلط ثابت ہو جانے پر بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ کیونکہ صدیوں سے اُن پر یقین رکھنے کے باعث وہ انسان کی عادت میں داخل

ہو چکی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ بے بنیاد اعتقادات کس طرح پیدا ہوئے۔ سائنس کی راہنمائی میں انسان نے کائنات کی حقیقت کو کہاں تک سمجھا ہے۔ دُنیا اور جانداروں کی پیدائش کیسے ہوئی۔ دیوی دیوتا۔ خدا اور مذہب کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ نیکی اور بدی کیا ہے؟

ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اپنے مطالب کو نہایت ہی سادہ اور آسان زبان میں ادا کریں۔ اگر کہیں علمی اور سائنٹفک اصطلاحات کا استعمال ضروری سمجھا گیا ہے تو اُن کا مطلب بھی بخوبی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہم اُن دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی صورت میں ہمیں اس کتاب کو درجۂ کامیابی تک پہنچانے میں مدد دی۔ اس سلسلہ میں جناب لالہ انوپ چند صاحب آفتاب پانی پتی اور ڈاکٹر آر۔ کرشنا صاحب کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہم اُن تمام معزز مصنفین کا بھی تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی کتب سے ہم نے مدد لی ہے۔ کتبِ مذکور کی فہرست درج ذیل ہے:۔

1۔ مذہب اور اخلاق۔ مصنفہ سردار سر تارا سنگھ (ٹنڈی لاٹ)
2۔ وکاس واد۔ مصنفہ پنڈت وِنایک گنیش ساٹھے۔ ایم۔ اے۔
3- The evolution of The idea of God by Grant Allen
4- The origin of Species. by Charles Darwin.
5- Savage Survivals by J. Howard Moore.
6. World's Wonder Stories by A. Gowan Whyte.
7- The Religion of The open mind by Gowan Whyte.

^

8- An outline of The universe by J. G. Crowther.

9- The Descent of man by Charles Darwin.

10 Religion as a bar to progress by Charles T. Gorham.

11- Anthropology by Sir E. B. Tylor.

12 Mutual aid by Prince Kropatkin.

13- Digging up The past by Sir Leonard Woolley.

14- Belief and action by Vicount Samuel.

15- A short History of The world by H. G. Wells.

16 The origin of The world by R. Mecmillan.

17- Evolution and religion by J. T. Sunderland

18- Religions and Humanism by Hardyal M.A.

19- Mysteries and Marvels of Science.

20 The miracle of life.

ع تُو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا

حرکت ہی کا نام زندگی ہے۔ دُنیا کی ہر شے حرکت میں ہے۔ زمین گھوم رہی ہے۔ آسمان میں ستارے سیارے چکر لگا رہے ہیں۔ اس حرکت سے ہی یہ سب قائم ہیں۔ انسان بھی حرکت نہ رہنے پر مُردہ ہو جاتا ہے۔ پانی ایک جگہ جمع ہو جانے پر سڑ جاتا ہے۔ گندہ ہو جاتا ہے۔ روانی سے ہی دریا دریا ہے۔ نہیں تو جوہڑ ہے۔ قدرت کا یہ اُصول ہر جگہ یکساں کام کرتا ہے اس کے خلاف جو بھی جاتا ہے گر جاتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ پُرانی چیزوں سے جی اُکتا جاتا ہے۔ روز نیا کھانا نت نئی پوشاک اور نیا فیشن ہو تبھی اچھا لگتا ہے۔ بوسیدہ کپڑا بے کار ہو جاتا ہے، پھینک دیا جاتا ہے۔ لیکن دوستو کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ہم کتنی بُری طرح بعض سڑی گلی چیزوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے ہیں، جیسے بندریا اپنے مُردہ بچے کو سینہ سے چپٹائے پھرتی ہو۔

لوگ علم و ترقی کی دَوڑ میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔ نت نئی ایجادیں ہوتی ہیں۔ علم و عقل کو جِلا دی جاتی ہے۔ پُرانی تہذیب و تمدن کو نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔ باغ دُنیا کو نئے رنگ میں سجایا جا رہا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ بدلنا نہیں چاہتے۔ نئی بات ہمارے کانوں پر چبھتی ہے۔ تبدیلی سے

ردّو بدل سے ہمیں نفرت ہے۔ ۶ زمیں جُنبد نہ جُنبد گل محمّد۔ والی مثال ہم پر خوب عائد ہوتی ہے۔ ہم لکیر کے فقیر ہیں! رواجوں کے غلام ہیں! نئی بات بتانے والے کو، نیا راستہ دکھانے والے کو ہم نے ہمیشہ اپنا دُشمن سمجھا اپنی بھلائی چاہنے والوں پر ہم نے پتھروں کی بوچھاڑ کی۔ اُنھیں زہر کے پیالے بھر کر پلائے۔ مطلب یہ کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں اس گہری نیند سے کوئی جگائے اس دُنیا میں کسی چیز کو سکون نہیں۔ انسان آگے بڑھتا ہے یا پیچھے ہٹتا ہے۔ جو آگے بڑھتا ہے اُس کے لئے نئی زندگی کے راستے کُھل جاتے ہیں۔ اور جو ساکن رہتا ہے اُس کی رگوں کا خون مُنجمد ہو جاتا ہے۔ غضبناک موت اُسے نگل لیتی ہے۔ اب ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہم زندگی چاہتے ہیں یا موت؟

ہماری قدامت پرستی

ہمارا سماج اپنے کٹّرپن اور قدامت پرستی کے لئے مشہور رہے۔ ہم لوگوں میں رواج ہے کہ بلا سوچے سمجھے۔ بغیر اپنی عقل کا استعمال کئے جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے اُسی کو مانتے چلے جائیں۔ اور باتوں کو جانے دو۔ کیا ہم نے برسوں ریل گاڑی میں چڑھنا پاپ نہیں سمجھا؟ ہم یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرلیں وہی چھکڑہ گاڑی تھی اور ہم تھے۔

آج چیچک کے ٹیکہ سے ہزاروں جانیں بچتی ہیں۔ ماں باپ بڑے شوق سے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو نشتر لگوانے کے لئے ویکسینیٹر (ٹیکہ لگانے والا) کے پاس لے جاتے ہیں۔ کیا وہ زمانہ بھول گئے جب ٹیکہ کا نام سُنتے ہی ماں اپنے بچّوں کو آنچل میں چھپا لیتی تھی۔ اور بچوں کے باپ ویکسینیٹر کی جیب گرم کر کے ٹیکہ کی آفت سے اُنھیں بچا لیتے تھے۔ لیکن یہ نہ خیال کرتے تھے

کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے پیارے بچوں کو موت کے مُنہ میں دھکیل رہے ہیں۔

ہاتھ کا پمپ بڑے آرام کی چیز ہے۔ جب چاہا ہینڈل ہلایا گھڑوں پانی بھر لیا۔ جس گھر میں دیکھو نل کی کھڑکھڑاہٹ سُنائی دیتی ہے۔ ہندو مسلم سکھ پارسی سب اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ لیکن اس بچارے کو برسوں ہندوؤں نے چھُوا تک بھی نہیں۔ شاید یہ چھُوت چھات کے پُجاری اب بھُول ہی گئے کہ اس نل میں چمڑے کا واشر بھی ہوتا ہے۔

ایک نہیں ہزاروں ایسی مثالیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ دُنیا میں لوگوں نے ہر نئی بات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اُنھوں نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ شاید نئی چیز پُرانی سے زیادہ بہتر ہو۔ مفید ہو۔ اِن رواجوں کے غلاموں کی کہاوت ہے کہ جو چیز ہمارے باپ دادا کے لئے ٹھیک تھی وہی ہمارے لئے بھی ٹھیک ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کا علم مکمل تھا۔ اُس میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ جب کسی بہتری یا تبدیلی کا ذکر آتا ہے تو اُن کی یہی دلیل پیش ہو جایا کرتی ہے۔ یہ لوگ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنا ہی نہیں جانتے۔ اگر یہی ذہنیت سب کی ہو جاتی تو آج دُنیا میں جو ترقی نظر آتی ہے کبھی نہ ہوتی۔ ہم اب تک وحشیوں کی طرح جنگلوں میں زندگی بسر کرتے ہوتے۔ کھالیں اور چھالیں ہماری پوشاک ہوتیں اور پھل پھول ہماری خوراک!

وہ شخص جس نے چھتری ایجاد کی بارش کے موقع پر پہلی مرتبہ لندن جیسے شہر کے بازاروں میں جب نکلا تو اُسے دیکھ کر لوگ ہنسنے اور تالیاں بجانے لگے۔ اُس کے پیچھے ہو لئے۔ اُن تماشائیوں نے پل بھر کے لئے بھی یہ نہ سوچا

کہ جس کا ہم مذاق اُڑا رہے ہیں وہ اتنی بارش میں بھی سوکھے کپڑے لئے جا رہا ہے۔ اور ہم پانی میں تر بتر ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اُس سے پہلے کوئی چھتری لے کر نہ چلا تھا۔ اس لئے لوگوں کے لئے یہ ایک عجوبہ اور مذاق تھا۔ مگر جب اُس کو بازاروں میں دیکھتے دیکھتے لوگ عادی ہو گئے تو خود بھی چھتری استعمال کرنے لگے!

اب سے کچھ عرصہ پہلے بائسکل کے ٹائر ٹھوس ربڑ کے ہوا کرتے تھے ایسی سائکل کو تیز چلانے سے بہت ہچکولے لگتے تھے۔ مسٹر ڈنلپ کو خیال پیدا ہوا کہ ٹھوس ربڑ کے ٹائر کی بجائے اگر کھوکھلے ٹائر بنائے جائیں اور اُن میں ہوا بھر دی جائے تو اتنے ہچکولے نہیں لگیں گے۔ نیز سائکل بھی زیادہ تیز چلے گی۔ جب انھوں نے ہوائی ٹائروں والی سائکل تیار کر لی تو انھیں اپنی کامیابی پر بہت خوشی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اِس ایجاد سے دُنیا والے بھی فائدہ اُٹھائیں اس مطلب کو پورا کرنے کے لئے اُنھوں نے سائکلوں کی دَوڑ میں نئی سائکل کو دَوڑایا۔ دَوڑ کے میدان میں جب پہلی بار لوگوں کی نظر نئی سائکل پر پڑی تو انھوں نے اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ لیکن جب نئی سائکل نے پُرانی سائکل کے مقابلے میں کامیابی پر کامیابی حاصل کی تو لوگوں کو اس کی قدر معلوم ہوئی۔ رفتہ رفتہ تمام سائکلوں میں ہوائی ٹائر نظر آنے لگے۔ اور آج وہ دِن ہے کہ ٹھیلوں میں بھی ہوائی ٹائر لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پرتگال کے لوگ بھی کسی دوسرے مُلک سے اس بات میں کم نہیں ہیں۔ وہ بھی بالکل وہی کرتے ہیں جو صدیوں سے اُن کے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ وہاں اب بھی چار پہیوں کے چھکڑے کا رواج ہے جس کی بناوٹ بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ آج سے سینکڑوں برس پہلے تھی۔ اس کے چاروں پہیے اِسطرح

جکڑے ہوئے ہیں کہ چھکڑے کو گھماتے وقت سڑک پر رگڑ دے کر گھسٹ جاتے ہیں کیونکہ وہ موٹر کے اگلے پہیوں کی طرح آسانی سے گھوم نہیں سکتے - وہاں کی حکومت نے یہ دیکھ کر کہ ان پرانے چھکڑوں کی وجہ سے سڑکوں کی حالت بہت جلد خراب ہو جاتی ہے قانون بنایا کہ چھکڑوں کے دونوں اگلے پہیئے گھومنے والے بنائے جائیں۔ لوگ قانون توڑ کر جیل جانے اور جرمانہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو گئے لیکن انھوں نے اپنے باپ دادا کے وقت کی چیز کو بدلنا پسند نہ کیا۔ حکومت کو مجبوراً اپنا حکم واپس لینا پڑا !

دریائے آمیزن کے کنارے بہت بڑے جنگل ہیں۔ ان جنگلوں میں وحشی رہتے ہیں۔ یہ لوگ آدم خور ہیں جب وہ کوئی مذہبی رسم ادا کرتے ہیں تو آدمی کی بھینٹ دیتے ہیں۔ اگر کوئی اُن سے پوچھے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو اُس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ " پاپا " یعنی رواج ہے۔ حیرانی تو یہ ہے کہ جسے قربانی کے لئے چُنا جاتا ہے وہ بھی یہ خیال کرتا ہے کہ اُس کی عزت کی گئی !!

ہندوستان میں ستی کی رسم کو ختم ہوئے زیادہ دن نہیں گذرے۔ ابھی تک اُس کی یاد دلوں میں تازہ ہے۔ بے کس ابلاؤں کی پکار ابھی تک فضا میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ اُنھیں جیتے جی زبردستی مُردہ خاوند کی جلتی ہوئی چتا میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ اب بھی بنگال اور بہار سے کبھی کبھی ستی ہونے کی خبر آجاتی ہے۔ کئی بار پولیس نے عین موقع پر پہنچ کر ان بے زبانوں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑایا ہے۔ گورنمنٹ کو اس رسم کے ختم کرنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

کچھ برس ہوئے اسمبلی میں ڈاکٹر دیشمکھ نے بچوں کی شادی بند کرنے کے لئے بل پیش کیا۔ لوگوں نے طوفان برپا کر دیا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بچوں کی

شادی کرنا بند کر دیا جائے۔ اس کے ثبوت میں دھرم کے ٹھیکیداروں نے پوتھیاں پلٹ پلٹ کر ختم کر دیں۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ ہزاروں برس کی یہ پرانی رسمیں موجودہ زمانے کی ضروریات کے مطابق نہیں ہیں۔ اور ہم انھیں عقل کی کسوٹی پر کس کر ہی تسلیم کر سکتے ہیں تو قدامت پرستوں نے اسے ناقابل ٹھیرایا۔ یہ ہے رسم و رواج کی طاقت !

کسی ہندو سے چوٹی۔ مسلمان سے ڈاڑھی۔ سکھ سے کیس اور عیسائی سے نیکٹائی لگانے کی وجہ پوچھو تو سب طرح طرح کے جواب دیتے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان نشانوں کے پیچھے یہ لوگ اتنے پاگل ہیں کہ آئے دن سینکڑوں فسادات انہی کی وجہ سے ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی مسجد اور باجے کا سوال ہے تو کبھی پیپل کے کٹنے کا۔ آج گائے کی قربانی کا جھگڑا ہے تو کل جھٹکے اور حلال کا غرض کہ یہ مذہبی دیوانے کسی نہ کسی بہانے ایک دوسرے کا سر توڑنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک جانور کے لئے۔ معمولی پیڑ کے لئے کاغذی تازیے کے لئے انسان انسان کا خون بہا دیتا ہے۔ کیا یہی انسانیت ہے؟ کیا یہی مذہب ہے؟ اور اگر کوئی ان سے پوچھے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو جواب میں اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ یہ تو رواجات کے پیچھے آنکھیں بند کرکے چل رہے ہیں۔ قوم کی بھلائی اور برائی سے انھیں کیا واسطہ !

دھرم کے ٹھیکیداروں نے دُنیا میں کون سا ظلم نہیں کیا ! اُنھوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کو حیوانوں سے بھی بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ہے جو لوگ دن رات سماج کی خدمت کرتے ہیں۔ سب کا پاخانہ اُٹھاتے ہیں۔ گندے سے گندہ کام کرتے ہیں۔ اُنھیں اس جاں فشانی کے بدلے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اُن کے سایہ سے بھی پرہیز کیا جاتا ہے۔ اور یہ سب ہوتا ہے

دھرم کی آڑ ہیں! اُنھیں بتایا جاتا ہے کہ ایشور نے تھیں اسی لئے پیدا کیا ہے وہ اگر ترقی بھی کرنا چاہیں تو اُن کے لئے سب راستے بند ہیں۔

دُنیا کی ترقی کے راستے میں وہ لوگ زیادہ روڑا اٹکاتے ہیں جن کے مفاد یا وقار کو نئی بات یا تبدیلی سے دھکّا لگتا ہو۔ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ جن باتوں کو وہ مانتے چلے آئے ہیں اور جن باتوں کا پرچار کرتے رہے ہیں غلط ثابت ہو رہی ہیں تو وہ آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی نہیں پسند کرتے کہ کوئی اُن کی باتوں کو غلط ثابت کرے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے سوچنے کا طریقہ۔ اُن کی باتیں ہی ٹھیک ہیں اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے جھوٹ ہے۔ اُن کے غصہ کی آگ میں کتنوں ہی کو جلنا پڑا ہے۔ یہودیوں نے مسیحؑ کو صلیب پر اسی لئے چڑھایا تھا کہ وہ ایسی باتوں کا پرچار کرتے تھے جو اُن کے مذہب کے خلاف تھیں۔ صدیوں بعد مسیحؑ ہی کے ماننے والوں نے اُن لوگوں کو قتل کیا۔ زندہ جلایا جنھوں نے اُن کی باتوں سے اختلاف کیا۔ یا نئی بات کہنے کی ہمّت کی! حضرت محمدؐ نے جب اپنی آواز بُت پرستوں کے خلاف بلند کی تو اُنھیں پتھروں کا سامنا کرنا پڑا ہزاروں مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ اس لئے کہ انھوں نے نئی بات کہی۔ برسوں بعد انہی کے پیرؤوں نے منصور کو سولی پہ چڑھایا صرف اس لئے کہ اُس نے شریعت کے خلاف کہنے کی جُرأت کی! ہندؤوں نے رشی دیانند کو زہر دیا کیونکہ وہ ویدوں کی تعلیم کو نئے رنگ میں رنگ رہے تھے۔ دُنیا کی تاریخ اُن دلیروں کے خون سے سُرخ ہے جنھوں نے نئی بات کہنے کی ہمّت کی!

۱۵۴۳ء میں سائنسداں کوپرنکس نے اپنی کتاب میں ثابت کیا کہ زمین سُورج کے گرد گھومتی ہے۔ سُورج ایک بہت بڑا آگ کا گولا ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد گلیلیو نے پہلی مرتبہ دُوربین بنائی جس کی مدد سے اُس نے آسمان

اور سورج کا بغور معائنہ کیا۔ اس دیکھ بھال سے اُسے برسوں پہلے کوپرنکس کی کہی ہوئی بات کا یقین ہوگیا۔ گلیلیو نے اپنے مشاہدہ کو لوگوں پر ظاہر کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی۔ لیکن وہ لوگ اس بات کو کیسے مان سکتے تھے جنہیں انجیل پر یقین تھا۔ انجیل بتاتی ہے کہ زمین قائم ہے اور سورج اُس کے گرد گھومتا ہے۔ گرجوں کے پادریوں نے جن کے وقار کو اس نئی بات سے دھکا لگتا تھا فتویٰ دیدیا کہ گلیلیو کی کتاب کوئی نہ پڑھے۔ بیچارے گلیلیو کو بھی دھمکی دی گئی کہ وہ اعلان کرے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے جھوٹ ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اُسے تکلیفیں دی جائیں گی۔ بڈھے گلیلیو کی بیماری نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اُن کی بات کو مان لے۔ اس پر بھی ظالم پادریوں نے اُسے خطرناک سمجھ کر نظر بند رکھا۔ اور ایسی حالت میں ہی اُس بیچارے کو زندگی کے دن پورے کرنے پڑے۔ آج گلیلیو نہیں ہے لیکن اس کی یاد باقی ہے۔

چند صدیوں پہلے تمام عیسائی انجیل کو لاطینی میں پڑھتے تھے۔ اور مذہبی رسمیں بھی لاطینی زبان میں ہی ادا کی جاتی تھیں۔ لیکن اب ہر عیسائی اپنی زبان میں انجیل پڑھتا اور رسمیں ادا کرتا ہے۔ سب سے پہلے جس شخص نے انجیل کا ترجمہ لاطینی سے انگریزی میں کیا اُس کا نام وائی کلف تھا۔ وہ انگلستان میں کسی گرجے کا پادری تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ انجیل کو عوام بھی سمجھ سکیں۔ پادری لاطینی زبان میں انجیل پڑھ کر سناتے تھے عوام سنتے تو آتے تھے مگر سمجھتے خاک نہ تھے۔ انجیل کی لاطینی زبان مقدس بھی اس لئے اُسے سنتے رہتے تھے۔ عوام بھی چاہتے تھے کہ انجیل کا ترجمہ اُن کی زبان میں ہی ہو جائے تاکہ وہ اسے پڑھ کر سمجھ سکیں لیکن پادری نہیں چاہتے تھے کہ لوگ مذہب کو بجائے اُن سے سمجھنے کے براہِ راست کتاب سے سمجھ لیں۔ وہ اپنے طریقہ پر ہی لوگوں کو مذہب سکھانا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے فائدہ کی باتیں بھی سکھا سکیں۔ جب انجیل صرف لاطینی

زبان میں تھی تو وہ لوگ جو لاطینی نہیں جانتے تھے عیسائیت کو پادریوں کے ذریعہ ہی سیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ وائی کلف سے تمام پادری اور اُن کے ساتھی ناراض ہو گئے۔ اُس کو مذہب سے خارج کر دیا۔ ایک پادری نے تو اُسے شیطان کا دایاں بازو، عیسائیت کا دشمن، کافروں کا سردار اور جھوٹ کا گودام وغیرہ بھی بنا ڈالا۔ یہاں تک کہ وائی کلف کے مرنے کے چالیس برس بعد اُس کی ہڈیاں قبر سے نکالی گئیں۔ اُن کو جلایا گیا۔ اور راکھ دریا میں پھینک دی گئی۔ پادریوں نے لوگوں سے کہا۔ وہ وائی کلف کی بائبل نہ پڑھیں۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ کسی کے پاس وائی کلف کی ترجمہ کی ہوئی انجیل ہے تو اُسے ایک خونی مجرم کی طرح سزا دی جاتی تھی!

یہ سُنکر آپ کو تعجب ہوگا کہ ایسی حالت میں ہی سو برس گذر گئے۔ کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ انجیل کا لاطینی سے ترجمہ کر سکے۔ وہ دوسرا شخص جس نے انجیل کا ترجمہ کیا ولیم ٹنڈیل تھا۔ اُسے بھی سینکڑوں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس زمانہ میں چھاپنے کی مشین کی ایجاد ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ ٹنڈل نے جرمنی میں جا کر ایک چھاپہ خانہ میں انجیل کا ترجمہ چھپوایا۔ اور اُن کو خفیہ طور پر انگلستان میں بھیجا۔ کتابوں کو کپڑوں میں۔ آٹے کی بوریوں اور دوسری چیزوں میں چھپا کر بھیجا جاتا تھا۔ لیکن کسی طرح ایک پادری کو اس کا علم ہو گیا اسپر تمام بندرگاہوں کی ناکہ بندی کر دی گئی اور ہر چیز کی انگلستان میں لے جانے سے پہلے تلاشی لیجانے لگی۔ اگر کوئی کتاب پکڑی جاتی تو اُسے جلا دیا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ لندن کے لاٹ پادری نے اعلان کیا کہ وہ ٹنڈل کی چھپائی ہوئی تمام انجیلیں خرید لے گا تاکہ وہ اُنھیں جلا دے۔ اس پر ٹنڈل رضامند ہو گیا اور انگریزی میں چھپے ہوئے انجیل کے تمام نسخے لاٹ پادری کے ہاتھ بیچ دیئے۔ اُس روپے سے وہ پہلے سے بھی عمدہ اور بہتر ترجمہ شدہ انجیل چھپوا کر بھیجنے لگا۔ ٹنڈل کے دشمنوں نے جب یہ دیکھا

کہ وہ ان کتابوں کا انگلستان میں آنا نہیں روک سکتے تو وہ ایسی ترکیب سوچنے لگے جس سے ٹنڈل کو گرفتار کیا جا سکے۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہم نے ٹنڈل کو معاف کر دیا اور وہ انگلستان میں بے کھٹکے آسکتا ہے۔ ٹنڈل نے آنے سے پہلے تو انکار کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ انگلستان کا بادشاہ اُسے اِن مذہبی درندوں کے چُنگل سے بچا نہ سکے گا۔ لیکن ایک عیار شخص جس پر وہ بھروسہ رکھتا تھا ٹنڈل کو بہکا کر انگلستان لے آیا۔ اور وہاں جا کر اُس سے دغا کی۔ ٹنڈل پکڑا گیا۔ اور قتل کر کے جلا دیا گیا۔ اس کے بعد انگلستان میں مذہبی انقلاب ہوا (پروٹسٹنٹ ریفارمیشن) اور ۱۵۳۹ء میں لوگوں کو انگریزی میں انجیل پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ یہ ہے مذہبی رواج کی ایک مثال!

لاطینی انجیل کا رکھنا رواج تھا۔ چاہے اُسے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرنا رواج کے خلاف تھا۔ اس رواج کو بدلنے کے لئے لوگوں کو جانیں تک دینی پڑیں!

دُنیا کی پیدائش کے متعلق تمام مذاہب کا اپنا اپنا خیال ہے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے کُن کے کہنے سے دُنیا بنا دی۔ عیسائی کہتے ہیں کہ گاڈ نے زمین اور تمام جانداروں کو چھ دن میں پیدا کیا۔ اور ساتویں دن آرام فرمایا۔ ہندو مانتے ہیں کہ برہما نے پہلے ایک سُنہری انڈا بنایا اور اُس سے ساری دُنیا پیدا کی۔ رشی دیانند نے ویدوں سے ہی ثابت کیا کہ زمین کے بن جانے کے بعد تمام جانداروں کے نر و مادہ جوانی کی حالت میں زمین پھوڑ کر باہر نکل آئے۔ لیکن پروفیسر ڈارون نے برسوں کی محنت اور چھان بین کے بعد دُنیا کے متعلق نئی باتیں کھوج نکالیں۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ تمام جانداروں کا ایک پُرکھا مل نا ہے۔ کُتّا بھیڑیئے سے۔ بلّی کا شیر سے زیبرے (دریائی گھوڑے) کا گدھے سے

سے۔ چھپکلی کا سانپ سے نزدیکی رشتہ ہے۔ جیسے تمام مختلف قسم کے کبوتر مثلاً لقا۔ لوٹن۔ شیرازی۔ اصیل۔ یاہو وغیرہ سب جنگلی کبوتر کی اولاد ہیں ویسے ہی ایک ہی آباو اجداد سے مختلف قسم کے تمام جانوروں کی پیدائش ہوئی ہے آج اس کتاب کو لکھے ہوئے تقریباً اسّی برس ہو چکے ہیں۔ اب تمام باعلم اشخاص نے ڈارون کی ڈھونڈی ہوئی سچائی کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن جس زمانہ میں ڈارون نے یہ خیال دُنیا کے سامنے رکھا تو لوگوں نے اُسے جھوٹا اور خطرناک کہا تھا۔ ڈارون نے تمام بوچھاڑوں کو سہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ سچائی یہ ہے اور اُس کی فتح ضرور ہوگی۔ لیکن یہ اُس کی ہی دلیری تھی کہ اُس نے تمام دُنیا کے عام عقیدے کے خلاف کہنے کی جرات کی۔ وہ ایک رواج سے لڑ رہا تھا۔ اُس کی لڑائی تیس۳۰ برس تک جاری رہی۔ لوگ اپنے پُرانے ڈھنگ پر سوچنے کے عادی تھے۔ اُس نے اُنھیں مجبور کیا کہ وہ اُن باتوں کو دیکھیں جن کی طرف اُن کا دھیان پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ باوجود ان کوششوں کے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو آنکھیں ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے کسی سچائی کے ثابت ہو جانے پر بھی وہ اُسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ ماننا ہی نہیں چاہتے۔ اس چیز کو اگر آپ اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو ہم ایک کہانی سُناتے ہیں۔ ایک بادشاہ تھا جو نئے کپڑوں کا شوقین تھا۔ وہ ہمیشہ نئے نئے سُوٹ بدلا کرتا تھا۔ ایک دن دو مسخرے اُس شہر میں آ گھسے۔ اُنھوں نے آتے ہی مشہور کر دیا کہ وہ ایسے عجیب کپڑے بُن سکتے ہیں جو کسی ایسے شخص کو نظر نہیں آتے جو بیوقوف ہو۔ بادشاہ کا سُننا تھا کہ اُس نے اُن دونوں کو بُلوا کر حکم دیا کہ وہ ویسا ایک جوڑا اُس کے لئے بھی تیار کر دیں۔ دوسرے دن بادشاہ نے وزیرِ اعظم کو بھیجا کہ وہ کپڑوں کو بُنتا ہوا دیکھ آئے۔ اُن چالاکوں نے وزیر کو کچھ خالی کھڈیاں دکھا دیں اور خود اُن پر اِس طرح ہاتھ چلانے لگے

گویا وہ کپڑا بُن رہے ہیں۔ وزیر کو وہاں کپڑا تو نظر نہ آیا لیکن اُسے یہ ڈر تھا کہ اگر وہ یہ ظاہر کرے گا کہ وہاں کوئی کپڑا نہیں ہے تو سب اُسے بیوقوف خیال کریں گے۔ اس لئے اپنے کو عقلمند ثابت کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے جاکر کپڑے کی بہت تعریف کی۔ بادشاہ نے دوسرے وزیر کو بھیجا۔ وُہی بات اُس نے بھی کہی۔ چند دنوں کے بعد مسخرے بادشاہ کے پاس گئے اور کپڑا دکھانے لگے۔ بادشاہ کو نظر تو کچھ نہ آیا۔ لیکن وہ بھی بیوقوف کہلانا نہیں چاہتا تھا۔ اُن چالاکوں نے بادشاہ کے جسم پر اس طریقہ سے ہاتھ پھیرنا شروع کیا جیسے وہ پوشاک پہنا رہے ہوں۔ تھوڑی دیر میں کہدیا کہ پوشاک پہنا دی گئی۔ یہ پوشاک نئی اور عجیب تھی اس لئے ضروری تھا کہ تمام لوگ اُسے دیکھیں۔ ان خیالی کپڑوں کو پہنکر بادشاہ شہر میں نکلا۔ لوگوں کی بھیڑ بادشاہ سلامت کی پیشوائی کے لئے موجود تھی۔ جسے دیکھو نئی پوشاک کی تعریف کر رہا تھا۔ سچ پوچھو تو کسی کو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ لیکن کوئی بیوقوف کہلانا کیسے برداشت کرسکتا تھا مگر ایک چھوٹا سا بچہ یہ سب دیکھ کر بہت حیران تھا۔ وہ لوگوں کی زبان سے بادشاہ کے کپڑوں کی تعریف تو سُن رہا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھیں کچھ نہ دیکھتی تھیں۔ آخرکار وہ چلا اُٹھا کہ بادشاہ کے بدن پر تو کچھ بھی نہیں۔ لوگوں کو احساس ہوا کہ اُن سبکو بیوقوف بنایا گیا ہے۔ بادشاہ بھی جان گیا کہ سب سے بڑا بیوقوف وہ خود ہے۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ شرما کر بھاگ گیا ہوگا؟ نہیں بلکہ وہ جلوس اُسی شان سے آگے بڑھتا رہا۔ تمام لوگ بھی یہی کوشش کرنے لگے کہ وہ خیالی کپڑوں والا ڈھونگ بنا رہے۔ کیونکہ وہ ایک مرتبہ اُس ڈھونگ کو شروع کرچکے تھے۔ کیا وہ بچہ سب سے دانا نہ تھا جس نے وہی دیکھا جو وہاں تھا۔ جبکہ تمام لوگوں نے بیوقوف بننے کے ڈر سے حقیقت کو چھپائے رکھا؟

دُنیا کیسے بنی؟

اُس زمانہ میں جبکہ انسان میں درجۂ حیوانیت سے نکلکر سوچنے کی قوت پیدا ہوئی فلاسفروں اور دوسرے سمجھداروں نے اپنی اپنی سمجھ اور علمی ترقی کے مطابق اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ میں کہاں سے آیا؟ کائنات کی یہ تمام چیزیں کیسے بنیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جنھیں وہ حل کرنا چاہتے تھے جس طرح بچے کسی بات کو صحیح طور پر نہ سمجھنے پر اس کے متعلق خود ہی کوئی نظریہ قائم کر لیتے ہیں، اُسی طرح دُنیا کے مختلف حصّوں کے لوگوں نے بھی کائنات اور انسان کی ابتدا کے معمّہ کو اپنے اپنے طور پر حل کرنے کی ناکام کوشش کی ہے زمین۔ آسمان۔ ستاروں۔ سیّاروں اور چاند سورج کے متعلق اُن کے ایسے ایسے خیالات تھے جو آجکل کے علم کی روشنی میں عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ بعض زمین کو ایک لمبا چوڑا میدان سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ آسمان بہت بڑا گنبد ہے جو زمین کے اوپر بنا ہوا ہے۔ اس گنبد میں چھید ہیں جن میں سے پانی زمین پر گرتا ہے تو بارش ہوتی ہے۔ آسمان میں ستارے سونے کی کیلوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ آسمان زمین سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ سُورج پُورب سے نکلکر پچھم میں ڈوبنے پر زمین کے نیچے چلکر دوبارہ صُبح کو پُورب سے نکل آتا ہے۔

مشہور سیّاح سرجان لیک اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جب مغربی افریقہ میں جزیرہ سینگا کی ملکہ سے پوچھا گیا کہ دُنیا کس نے بنائی؟ تو ملکہ نے بلا پس وپیش

جواب دیا کہ "میرے آباؤ اجداد نے" یہ ہے ایک طریقہ پیدائش عالم کے بتانے کا!

بہت سی قوموں کا کسی نہ کسی شکل میں یہ خیال رہا ہے کہ دُنیا کی ابتدا ایک انڈے سے ہوئی ہے۔ فنیّوں (Fins) کا خیال تھا کہ ابتدائی انڈے کی زردی سے زمین بنی۔ اور سفیدی سے زمین کے چاروں طرف کے سمندر۔ اسی طرح قدیم برہمنوں کا خیال (جیسا کہ منوسمرتی میں درج ہے) یہ تھا کہ شروع میں پرماتما نے خیال کی طاقت سے پانی پیدا کیا اور اُس پانی میں ایک بیج ڈالا جو سُنہری انڈا بن گیا۔ اُس انڈے میں سے خود پرماتما برہما کی شکل میں پیدا ہوا جس نے تمام عالم کو بنایا۔

پارسیوں کی کتاب زندواستھا کا بیان ہے کہ شروع میں آدپرُش نے دو دیوتا بنائے۔ اورمزو نیکی کا اور دوسرا ارھی مان بدی کا دیوتا تھا۔ ارمزد نے پہلے آسمان اور زمین بنائی۔ سب سے آخر میں انسان کو بنایا۔

اسی طرح پیدائش عالم کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کا خیال ہے کہ خدا نے تمام عالم کو چھ دن میں پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ خدا نے کُن کہا اور تمام کائنات بن گئی۔

پیدائش عالم کے بارے میں یہ خیالات بچّوں کی سی باتیں ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا یہ بالکل کہانیاں سی نہیں ہیں؟ کیا مختلف لوگوں کی ان طرح طرح کی روایتوں کو تاریخ کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ سچ مُچ گذرے ہوئے واقعات کے بیانات کہے جا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ہر روایت کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ تمام قصّے اور روایتیں اُن لوگوں کے دماغ کی خیالی پیداوار ہیں جو پیدائش عالم کے بارے میں سوچتے رہے ہیں۔

گذشتہ چند صدیوں میں انسان نے علم اور سائنس میں اتنی ترقی کی ہے کہ ان باتوں کے متعلق اس کی معلومات بہت بڑھ گئی ہیں۔ دن بدن قدرت کے چھپے ہوئے رازوں کا انکشاف کیا جا رہا ہے۔ نئے سے نئے آلات اور تیز سے تیز دُوربینیں تیار ہو چکی ہیں۔ سب سے بڑی اور تیز دُوربین امریکہ میں ولسن پہاڑ پر موجود ہے۔ دس سال کی محنت کے بعد ایک اور دُوربین تیار کی گئی ہے جس کے شیشے کا قطر ۲۰۰ دو سو انچ ہے۔ یہ دُوربین امریکہ میں پالومر پہاڑ پر سطح سمندر سے پانچ ہزار سات سو فٹ کی اُونچائی پر قائم کی جا رہی ہے۔ اس دوربین کے ذریعہ چاند اتنا نزدیک معلوم ہوگا جیسے کہ کوئی ۲۵ میل کے فاصلہ سے دیکھ رہا ہو۔ یہ دُوربین اتنی تیز ہے کہ دس ہزار میل کے فاصلہ پر رکھی ہوئی موم بتی بھی صاف نظر آتی ہے۔ ان آلات سے انسان نے ایسی ایسی باتوں کو معلوم کر لیا ہے جو پہلے زمانہ کے لوگوں کے قیاس میں بھی نہیں آ سکتی تھیں۔ اب ہم ان معلومات کی بنا پر چند باتیں آپ کے سامنے رکھیں گے جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ دُنیا کس طرح بنی ہے۔

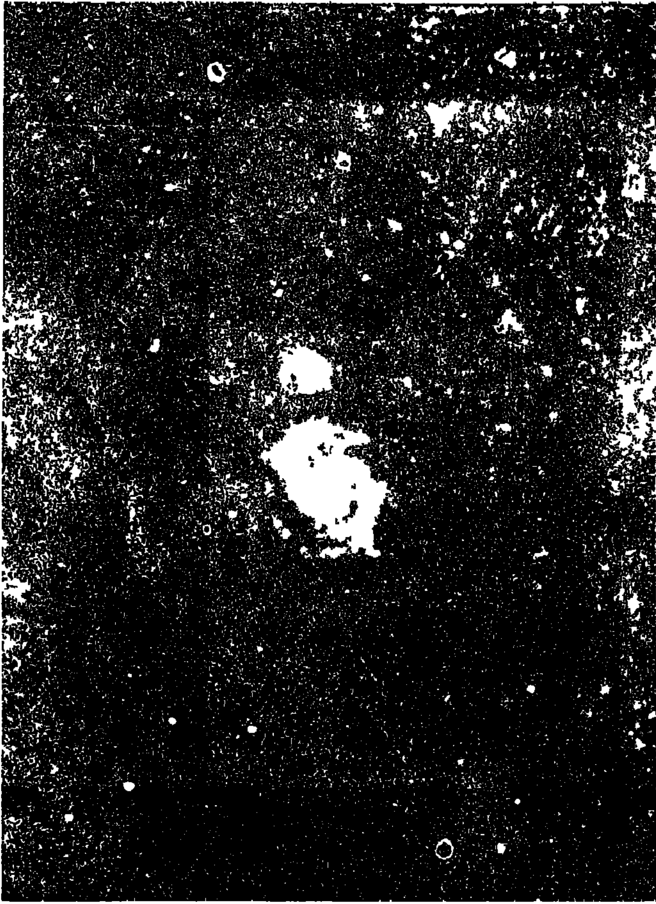
نظامِ عالم

ستارے

اندھیری رات کو آسمان میں ستاروں کی جگمگاہٹ کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گویا ہزاروں بتیاں جل رہی ہیں۔ لیکن دُوربین کے ذریعہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ٹمٹماتی ہوئی بتیاں بتیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے سُورج کی طرح بڑے بڑے سُورج ہیں۔ یہ اتنے دُور ہیں کہ ہمیں ننھے ننھے چمکتے ہوئے نشان سے ہی نظر آتے ہیں

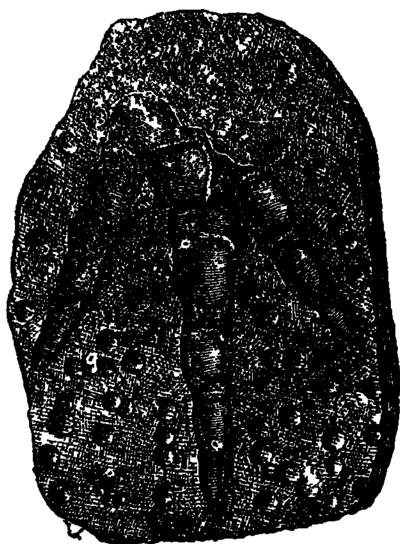
بعض ستارے تو ہمارے سُورج سے بھی بڑے اور چمکدار ہیں۔ ان میں سے وہ ستارے جن کی نیلی روشنی ہے سُرخ روشنی والے ستاروں سے چھوٹے ہیں۔ ستارے اتنے بڑے ہیں کہ اُن کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ بغیر مثال کے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ برہسپتی سیارہ اتنا بڑا ہے کہ ہماری زمین جیسے ایک ہزار جسم بھی اس کے برابر نہیں ہوتے۔ اسی طرح سُورج برہسپتی سے ایک ہزار گُنا بڑا ہے۔ لیکن نیلے ستارے ہمارے سُورج سے ایک ہزار گنا بڑے ہیں۔ اور سُرخ ستارے تو نیلے ستاروں سے ایک ہزار گنا سے بھی بہت زیادہ بڑے ہیں۔

بعض ستارے بہت ہی تیز روشنی سے جل رہے ہیں۔ بعض کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جل چکے ہیں۔ اور خلاء میں چمکتی ہوئی گیس کی صُورت میں چکر لگا رہے ہیں۔ کچھ ایسے ستارے بھی ہیں جو بہت تیزی سے جل رہے ہیں۔ لیکن اپنے مادہ کو بھی ادھر اُدھر پھینک رہے ہیں جس سے وہ جسامت میں چھوٹے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ میں اُن کا تمام مادہ خلاء میں پھیل جائے گا۔ ہمارا سُورج بھی ایک ستارہ ہے۔ اور ان ستاروں ہی کی طرح جل رہا ہے۔ آسمان میں دُوربین کے ذریعہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ستارے جل جل کر اپنے مادہ کو خلا میں پھینک کے ختم ہو رہے ہیں۔ اُسی طرح اُن کی جگہ نئے ستارے بھی بنتے جا رہے ہیں۔ وہ مادہ جو یہ جلتے ہوئے ستارے پھینکتے ہیں خلا میں ذرات کی صُورت میں پھیلجاتا ہے۔ خلا میں جب یہ ذرات آپس میں ٹکرا کر رگڑ کھاتے ہیں تو گرمی پیدا ہوتی ہے ایک دوسرے کی کشش سے باہم مل کر گیس کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں یہی سلسلہ لگاتار جاری رہتا ہے۔ مادہ کے ذرات آپس میں مِلتے مِلتے بہت بڑے



نیبولا یا ستاروں کی دُنیا کا ایک چمکتا ہوا مادّے کی گیس کا بادل۔ یہ نیبولا اپنے
گرد گھوم رہا ہے۔ مرکز میں ایک بہت بڑا ستارہ بن رہا ہے۔ اور کناروں پہ
چھوٹے چھوٹے ستارے بنتے نظر آتے ہیں

تصویر متعلقہ مضمون صفحہ ۲۵



چٹانی کتاب کا ایک ورق:- کسی جانور کے پنجوں اور بارش کی بوندوں کے نشانات جو ایک پتھر پر بنے ہوئے پائے گئے ہیں یہ پتھر کبھی مٹی تھا ؎

تصویر متعلقہ مضمون صفحہ ۴۳

بڑے گیس کے بادل بنجاتے ہیں۔ مادہ کی گیس کے ان بادلوں کو ہم نیبیولا (nebula) کہتے ہیں۔ نیبیولا آسمان میں گھومتا رہتا ہے۔ اور راستہ میں جو مادہ کے ذرّات ملتے ہیں وہ کھنچکر اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں جس سے اس کی جسامت بڑھتی جاتی ہے۔ نئے ذرّات کے ٹکرانے سے گرمی بھی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ مادہ گرمی کی شدت سے شعلہ زن ہوجاتا اور چمکنے لگتا ہے نیبیولا میں جہاں کہیں ذرات آپس میں زیادہ جُڑ جاتے ہیں وہ حصّے زیادہ چمکنے لگتے ہیں۔ اور ستاروں کی شکل میں نظر آنے لگتے ہیں۔ لیکن ان کے اردگرد کا مادہ گیس کے بادلوں کی ہی صُورت میں رہتا ہے۔ جو رفتہ رفتہ ذرّات کے جُڑتے جانے سے آخرکار ستاروں میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ دُوربین سے دیکھنے سے آسمان کے مختلف حِصّوں میں نیبیولا مختلف شکلوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں پر بے ڈول صُورت میں مادہ کی گیس کے چمکدار بادل پھیلے ہوئے ہیں کہیں نیبیولا اپنے گرد گھوم رہے ہیں۔ اور درمیان میں ستارے بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی اُن کے چاروں طرف کا حصّہ بھی چمک رہا ہے۔ اسی ڈھنگ سے وہ ستارہ بھی جسے ہم سُورج کہتے ہیں کسی نیبیولا سے بنا تھا۔

ستاروں کی تعداد

ستاروں کی تعداد کتنی ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ زیادہ سے زیادہ گننے پر ہمیں تین چار ہزار ستارے نظر آتے ہیں۔ لیکن تیز دُوربین کے ذریعہ اُن کے علاوہ ۱،۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰ ڈیڑھ اَرب تارے اور نظر آنے لگتے ہیں۔ اس پر بھی کروڑوں ایسے تارے ہیں جو نظر نہیں آتے کیونکہ اُن کے دیکھنے کے لئے ابھی تک اتنی زبردست دُوربین نہیں بنی جس سے وہ نظر آ سکیں۔

ستاروں کا فاصلہ

ستارے ہماری زمین سے اس قدر دُور ہیں کہ اُن کا

فاصلہ میلوں میں ناپا نہیں جا سکتا۔ دماغ اتنے لمبے فاصلہ کو سمجھنے سے قاصر ہے اس لئے ستاروں کے فاصلہ کو سمجھنے کے لئے روشنی کی رفتار سے کام لیا گیا ہے جب ہم ٹارچ سے دُور کسی چیز پر روشنی ڈالتے ہیں تو ٹارچ سے اُس چیز تک روشنی کے پہنچنے میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور لگتا ہے۔ چاہے وہ ایک سیکنڈ کا کروڑواں حصّہ ہی کیوں نہ ہو۔ ویسے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹارچ کا بٹن دبایا اور روشنی وہاں پہنچ گئی۔ تجربہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ روشنی کی رفتار ایک سو چھیاسی ہزار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے۔ اس حساب سے چاند سے زمین پر روشنی کے آنے میں سوا سیکنڈ خرچ ہوتا ہے۔ چاند کا فاصلہ زمین سے دو لاکھ انتالیس ہزار ۲۳۹،۰۰۰ میل ہے۔ سورج کی روشنی زمین تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ سورج زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ ۹۳،۰۰۰،۰۰۰ میل دُور ہے۔ اسی حساب سے سب سے نزدیک والے ستارے سے ہماری زمین تک روشنی آنے میں چار برس سے اوپر لگتے ہیں۔ اگر یہ ستارہ آج چمکنا بند کر دے تو بھی ہمیں چار برس تک چمکتا ہوا نظر آتا رہے گا ہم نے صرف سب سے نزدیک ستارے کا ہی فاصلہ بتایا ہے۔ ورنہ بعض ستارے تو اتنے دُور ہیں کہ اُن کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں تیس ہزار ۳۰،۰۰۰ برس لگتے ہیں۔ اب آپ کو کچھ اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ ستارے کتنی دُور ہیں۔ ستارے اتنے بڑے بڑے ہیں کہ اُن کی لمبائی چوڑائی قیاس میں بھی نہیں آسکتی۔ حال ہی میں سب سے بڑے ستارے کی جسامت کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ اِس ستارے کا نصف قطر ہی ایک ارب بیس کروڑ ۱،۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا قطر سورج اور زمین کے فاصلہ سے بھی چالیس گُنا زیادہ ہے۔ ستارے سیّارے اور نیبولا وغیرہ سب کے سب گردش اور حرکت میں ہیں۔

نظامِ شمسی

زمین سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے اور چاند زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی گولے ہیں جو زمین کی طرح سورج کے گرد چکّر لگاتے ہیں۔ یہ سب ہماری زمین کو ملا کر سورج کے سیّارے کہلاتے ہیں۔ چاند زمین کا چاند کہلاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ زمین کے گرد ہی چکّر لگاتا ہے۔ دوسرے سیّاروں کے بھی اپنے اپنے چاند ہیں۔ سورج سیّارے اور اُن کے چاند یہ سب مل کر ایک خاندان بن جاتے ہیں۔ اس خاندان کو ہم نظامِ شمسی کہتے ہیں۔ ہمارا نظامِ شمسی تمام کا تمام مجموعی حیثیت سے خلا میں حرکت کر رہا ہے۔ سیّارے سورج کے گرد چکّر لگا رہے ہیں۔ لیکن سورج مع ان تمام سیّاروں کے ساڑھے بارہ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اُن ستاروں کے جھُنڈ کی طرف بڑھ رہا ہے جنھیں ہم لائیرا کہتے ہیں۔ ہر گھنٹہ کے بعد ہماری زمین بھی لائیرا (Lyra) کے بیس ہزار میل قریب ہو جاتی ہے۔ لیکن اتنی رفتار کے باوجود بھی خدا کی خدائی اتنی عظیم الشان اور وسیع ہے کہ لاکھوں برس کے گذر جانے پر کہیں یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے نظامِ شمسی اور ان ستاروں کی آپس میں ٹکّر ہو۔

اب ہم سب سے پہلے سورج کا جو اس نظام کا مرکز ہے ذکر کرتے ہیں:۔

سورج سورج بھی ایک ستارہ ہے۔ ستاروں کی نسبت ہمیں یہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ زمین سے اُس کی دُوری اور ستاروں سے بہت کم ہے۔ سورج ایک بہت بڑا آگ کا چمکتا ہوا گولا ہے۔ دُوربین کے ذریعہ دیکھنے سے اس کی سطح پر اُبھار نظر آتے ہیں۔ یہ اُبھار گیس کے بادل ہیں۔ کبھی کبھی سورج میں سیاہ داغ دکھائی پڑتے ہیں۔ حقیقت میں یہ داغ سورج کے اندر سے گیس

اور آگ کے باہر نکلنے کے لئے بڑے بڑے غار ہیں۔ ان میں سے خلا میں ہزاروں میل اونچے شعلے اُٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خاص بات تو یہ ہے کہ سُورج کا مادہ ٹھوس اور منجمد نہیں بلکہ گیس کی حالت میں ہے یہی وجہ ہے کہ یہ داغ گھٹتے بڑھتے اور شکلیں بدلتے رہتے ہیں۔ سُورج اپنے گرد تقریباً ۲۶ دن میں ایک چکر لگا لیتا ہے۔ اس کا وزن زمین سے تین لاکھ تیس ہزار گُنا زیادہ ہے۔ اور یہ زمین سے تیرہ لاکھ گُنا بڑا بھی ہے۔

سیّارے

رات کو آسمان میں ہزاروں ستارے نظر آتے ہیں۔ ان میں تھوڑے سے سیّارے ہیں۔ اور باقی سب ستارے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ہماری زمین کی طرح سیّارے بھی ستاروں سے بہت چھوٹے ہیں لیکن آسمان میں وہ ستاروں کی نسبت بہت بڑے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ زمین سے اُن کا فاصلہ کم ہے۔ دُوربین سے دیکھنے سے سیّارے گول رکابی کی طرح نظر آتے ہیں۔ اور ستاروں کو دیکھو تو وہ چمکتے ہوئے نشان سے معلوم ہوتے ہیں ستاروں اور سیّاروں کے پہچاننے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ جگمگاتے ہیں یا نہیں۔ ستارے جگمگاتے ہیں اور سیّارے نہیں جگمگاتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سیّارے سُورج کی روشنی سے چمکتے ہیں)۔ چاند اور سیّاروں میں جو چمک ہم دیکھتے ہیں وہ سُورج کی روشنی کے عکس سے ہے۔

بعض سیّارے ہماری زمین سے بہت بڑے ہیں۔ اور بعض چھوٹے۔ اب ہم سُورج سے سلسلہ وار ہر ایک سیّارے کا ذکر کرتے ہیں :۔

مرکری۔ (بُدھ۔ عُطارد)

یہ سیّارہ سُورج کے سب سے نزدیک ہے۔ اور سیّاروں میں سب سے چھوٹا ہے۔ اکثر سُورج ڈوبنے کے فوراً بعد مغرب میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کا قطر تقریباً تین ہزار چھ سو میل ہے۔ یہ سُورج سے

تین لاکھ ساٹھ ہزار ۳۶۰،۰۰۰ میل دُور ہے۔ اور سُورج کے گرد ۲۹ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ۸۸ دنوں میں ایک چکر پُورا کر لیتا ہے۔

وینس (شکر زہرہ) یہ سیارہ سورج سے چھ کروڑ سات لاکھ ۶۷،۰۰۰،۰۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ سُورج کے گرد اس کا ایک چکر ۲۲۴.۷ دنوں میں پورا ہوتا ہے۔ اس کی رفتار ۲۲ میل فی سکنڈ ہے۔ اعشاریہ

ہماری زمین سُورج سے باہر کی طرف چلتے ہوئے سیاروں کے شمار میں ہماری زمین تیسرے نمبر پر ہے۔ زمین سُورج کے گرد اپنا چکر ۳۶۵ دنوں یعنی ایک سال میں پُورا کرتی ہے۔ اور اپنے محور پر ۲۴ گھنٹوں میں ایک دفعہ گھوم جاتی ہے۔ زمین کا گھیر تخمیناً ۲۴۸۰۰ میل ہے۔ یہ سُورج سے تقریباً ۹۳،۰۰۰،۰۰۰ میل دُور ہے۔ یہی وہ فاصلہ ہے جس کی وجہ سے سطح زمین پر ایسا موسم رہتا ہے جس میں جاندار زندہ رہ سکتے ہیں اگر کہیں زمین سُورج کے کچھ اور نزدیک پہنچ جائے تو گرمی کی شدت سے تمام جاندار جل جائیں۔ اور اگر موجودہ فاصلہ سے اور دُور چلی جائے تو سردی اتنی بڑھ جائے کہ سب جاندار ٹھٹھر کر مر جائیں۔

چاند ہماری زمین کا ایک بچہ بھی ہے جسے ہم چاند کہتے ہیں۔ چاند زمین سے صرف دو لاکھ اُنتالیس ہزار ۲۳۹،۰۰۰ میل دُور ہے۔ یہ زمین سے بہت چھوٹا ہے۔ زمین کا قطر سات ہزار نو سو چودہ ۷۹۱۴ میل ہے اور اس کا صرف دو ہزار ایک سو ساٹھ ۲۱۶۰ میل ہے۔ یعنی چاند زمین کے تقریباً ایک چوتھائی کے برابر ہے۔ زمین کے گرد چاند کا چکر ۲۷ دن ۷ گھنٹہ اور ۴۳ منٹ میں پُورا ہو جاتا ہے۔ چاند سُورج کی طرح اپنی روشنی سے نہیں چمکتا بلکہ جب سُورج کی روشنی اس پر پڑتی ہے تو یہ

چمکتا ہے اور اُس کا عکس زمین پر پڑتا ہے۔ چاند کی سطح پر جو کالے کالے دھبے نظر آتے ہیں یہ اُس کے اندر بڑے بڑے گہرے غار ہیں۔ اور جو حصہ سفید نظر آتا ہے وہ اُونچے اُونچے بنجر پہاڑ ہیں۔ چاند میں بالکل گرمی نہیں ہے۔ اس کا ثبوت چاند کے آتش فشاں پہاڑ ہیں جو بالکل ٹھنڈے ہیں۔ چاند کبھی ہماری زمین کا ایک حصّہ تھا جو عہدِ قدیم میں زمین سے علیحدہ ہو گیا تھا۔

منگل۔ (مارس۔ مرّیخ)

سیّاروں میں زمین کا دوسرا پڑوسی منگل ہے۔ اور سُورج سے چوتھے نمبر پر ہے۔ اس کا زمین سے فاصلہ تقریباً تین کروڑ پانچ لاکھ ۳۵،۰۰۰،۰۰۰ میل ہے۔ اور سُورج سے چودہ کروڑ ایک لاکھ ۱۴۱،۰۰۰،۰۰۰ میل دُور ہے۔ یہ زمین سے بہت چھوٹا ہے۔ اس کا قطر چار ہزار دوسو پندرہ ۴۲۱۵ میل ہے۔ منگل میں ہوا موجود ہے۔ اور کئی مرتبہ بادل بھی پھیلے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ اس لئے بعض سائنسدانوں کا خیال ہے کہ شاید اس دُنیا میں بھی جاندار ہیں۔ لیکن یہ بات ابھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ اس سیارے کے بھی دو چاند ہیں جو اس کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔

برہسپتی (جوپیٹر۔ مُشتری)

سُورج کے تمام سیّاروں میں سب سے بڑا ہے۔ اس کا قُطر چھیاسی ہزار پانچ سو ۸۶۵۰۰ میل ہے یعنی زمین سے تیرہ سو نو ۱۳۰۹ گُنا بڑا ہے۔ برہسپتی کا سال چار ہزار تین سو بتیس ۴۳۳۲ دنوں کا ہے۔ اور اپنے محور پر صرف نو گھنٹہ اور ۵۵ منٹ میں گھوم جاتا ہے۔ سُورج سے اس کا فاصلہ چار اَرب تیراسی کروڑ ۴۸۳،۰۰۰،۰۰۰ میل ہے۔ مشتری زمین کی طرح ٹھنڈا اور ٹھوس نہیں ہے بلکہ یہ ابھی تک گرمی کی وجہ سے پگھلی ہوئی حالت میں ہے۔ اور سُرخ انگارے کی طرح چمک رہا ہے۔ اس سیارے کے ۹ چاند ہیں جو اس کے گرد گھومتے ہیں

سنیچر (زحل) سنیچر سُورج سے آٹھ ارب چھیاسی کروڑ ۸٫۸۶۰٫۰۰۰٫۰۰۰ میل دُور ہے۔ یہ زمین سے بہت بڑا ہے۔ لیکن برہسپتی سے چھوٹا ہے۔ اس کا قطر تقریباً اکہتّر ہزار میل ہے۔ سنیچر بھی ابھی تک بہت گرم اور نیم جامد حالت میں ہے۔ یہ سُورج کے گرد ۲۹½ سال میں ایک مرتبہ گھوم جاتا ہے سنیچر میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے گرد دو حلقے نظر آتے ہیں جو نہایت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان حلقوں کے علاوہ سنیچر کے گرد نو چاند بھی گھومتے ہیں۔

یُورینس قدیم زمانہ میں سنیچر کو نظام شمسی کا آخری سیّارہ مانتے تھے۔ لیکن ۱۷۸۱ء میں سرولیم ہرشل نے اس سیّارے کو آسمان میں گھومتا ہوا ڈھونڈ نکالا۔ یورینس سُورج سے اٹھارہ ارب ۱۸٫۰۰۰٫۰۰۰٫۰۰۰ میل دُور ہے۔ اور سُورج کے گرد ۸۴ سال میں ایک چکّر پُورا کرتا ہے۔ اس کا قطر تیس ہزار ۳۰٫۰۰۰ میل ہے۔ تمام سیاروں کی نسبت اس کی اپنے گرد گھومنے کی رفتار سب سے زیادہ ہے۔ یعنی صرف ۷ گھنٹوں میں اپنے محور پر گھوم جاتا ہے۔ اس کے بھی چار چاند ہیں۔ سنیچر اور مشتری کی طرح یہ بھی بہت زیادہ گرم ہے اور پگھلی ہوئی حالت میں ہے۔

نیپچون نیپچون کی دریافت کا قصہ عجیب ہے۔ ایک وقت تھا جب علم سیّارگان کے ماہروں کو زمین، شکر، منگل وغیرہ سیاروں کا تو علم ہو چکا تھا کہ وہ سُورج کے گرد گھومتے ہیں اور ان کی حرکت یا چال کا بھی اُنھیں پتہ لگ چکا تھا۔ لیکن نیپچون کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ انیسویں صدی کے شروع میں علم جوتش کے ماہروں نے حساب کے ذریعہ شمار کر کے دیکھا کہ جو سیّارے اُس زمانہ تک دریافت کیے جا چکے تھے اُن کی رفتار کا حساب سیاروں کی

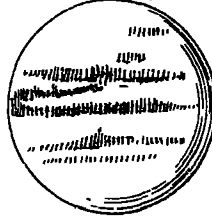
اصل رفتار سے ٹھیک نہیں ملتا۔ اس امر سے اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ نظامِ شمسی میں کہیں کوئی اور سیارہ بھی ہوگا جو اپنی کشش سے ان سیّاروں کی رفتار میں فرق پیدا کر رہا ہے۔ حساب لگا کر معلوم کیا گیا کہ نئے سیارے کو اس وقت آسمان کے فلاں حصہ میں ہونا چاہیئے۔ اِسی حساب کے مطابق جب ایک زبردست دُوربین سے آسمان کے اُس حصہ میں دیکھا گیا تو یہ سیارہ نظر آیا۔ اس سیارہ کا نام سائنسدانوں نے نیپچون رکھا۔

پلوٹو پلوٹو کی دریافت کا سہرا ابھی موجودہ سائنسدانوں کے سر پر ہے۔ نیپچون کی طرح اس کی دریافت ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی۔ یہ سیارہ سُورج سے نویں نمبر پر ہے۔ اور سُورج سے زمین کی نسبت ۴۰ گُنا زیادہ فاصلہ پر ہے سُورج کے گرد اس کا ایک چکر ۲۵۰ برس میں پُورا ہوتا ہے۔

مشتری یا برہسپت

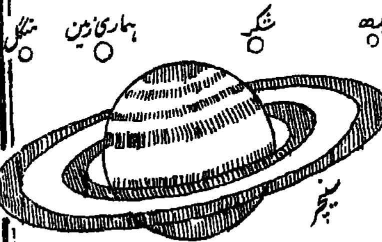


نقشہ ۱





منگل ہماری زمین شکر بدھ



سیّاروں کا نقشہ

ایک دوسرے کا آپس میں مقابلہ کرنے سے آپ کو سیاروں کے قد کا کچھ اندازہ ہو جائے گا

سیارے ایک دوسرے سے اتنے زیادہ فاصلوں پر ہیں اور اتنے بڑے بڑے ہیں کہ اندازہ لگاتے ہوئے دماغ چکرا جاتا ہے۔ اس لئے دوسری چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تشبیہ دے کر اسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ہم زمین کو ایک انچ کی گیند سمجھیں تو سورج نو فٹ کا گولا ہوگا جو زمین سے ۳۲۳ گز کے فاصلہ پر ہو۔ چاند چھوٹے مٹر کے دانے کے برابر اور زمین سے ڈھائی فٹ کے فاصلہ پر ہوگا۔ سورج کے زیادہ نزدیک دونوں ستارے بدھ اور شکر ۱۲۵ اور ۲۲۳ گز کے فاصلہ پر سلسلہ وار ہوں گے۔ زمین سے لے کر منگل ۴۹ گز اور برہسپت جو ایک فٹ کا گولا ہو ایک میل دور ہوگا۔ سنیچر ۲ میل۔ یورینس ۴ میل نیپچون ۶ میل اور اس کے بعد پلوٹو ۷ میل کے فاصلہ پر ہوں گے۔ اسی مثال کے مطابق زمین سے سب سے نزدیک ستارے کا فاصلہ ۵۰۰۰۰۰ یا پانچ لاکھ میل ہوگا۔

ان فاصلوں کو سمجھنے کے لئے ایک مثال اور لیتے ہیں۔ اگر ایک ریل گاڑی زمین سے سورج کی طرف ۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے روانہ ہو اور دن رات برابر چلتی رہے تو وہ چاند تک ۶ مہینے میں۔ اور سورج تک ۲۱۰ برس میں پہنچے گی۔ لیکن سب سے نزدیک ستارے پر پہنچنے میں اس گاڑی کو چار کروڑ برس لگ جائیں گے۔ مندرجہ بالا بیان سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کائنات کتنی بڑی ہے۔ اس میں ہماری زمین کی حیثیت جس پر زندگی کا [illegible] کھیلا جا رہا ہے ایک نقطہ سے زیادہ نہیں۔ تو بھلا پھر انسان کی کیا اوقات ہے جو اس ننھے سے سیارہ پر رہتا ہے۔

ہم اوپر سورج اور اس کے سیاروں کے خاندان کے متعلق مکمل طور پر بیان کر آئے ہیں۔ زمین بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس کا ایک بچہ بھی ہے جسے ہم چاند کہتے ہیں۔ اسی طرح مشتری کے نو چاند سنیچر کے [illegible]

یورینس کے ۴ اور نیپچون کا ایک چاند ہے۔

چاند اور زمین کا تعلق

چاند کو زمین کا بچہ کہنا محض خام خیالی نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً چاند بھی زمین کا ہی حصہ تھا۔ کسی زمانہ میں جبکہ زمین کی یہ شکل نہ تھی اور وہ پگھلے ہوئے گرم مادہ کی گیند تھی اُس وقت زمین موجودہ رفتار کی نسبت نہایت تیزی سے گھوم رہی تھی اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ اس کا کچھ حصہ اس سے علیحدہ ہوگیا۔ اور آسمان میں جو چاند نظر آتا ہے یہ وہی بچھڑا ہوا حصّہ ہے۔ بارش کے موقع پر جب چھتری پر پانی کی بوندیں پڑی ہوئی ہوں اُس وقت چھتری کو زور سے گھُمایا جائے تو پانی کی بوندیں دُور تک گرتی ہیں۔ اس سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح چاند زمین سے علیحدہ ہوا ہوگا۔ دوسرے سیاروں کے چاند بھی اسی طرح پیدا ہوئے۔ سنیچر کے پھینکے ہوئے تمام مادہ کے چاند نہیں بنے۔ بلکہ کچھ مادّہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں پھیل گیا۔ اور وہ حلقوں کی صُورت میں سنیچر کے گرد گھومنے لگا جو دُوربین سے دیکھنے سے نہایت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

اب سوال ہوتا ہے کہ سیّاروں کے چاند تو اپنے اپنے سیّارے سے نکلے ہیں۔ مگر یہ تمام سیّارے کہاں سے آئے اور کیسے بنے؟ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہماری زمین اور تمام سیّارے سُورج کے گرد ایسے ہی گھومتے ہیں جیسا کہ چاند زمین کے گرد اور دوسرے سیّاروں کے چاند اپنے اپنے سیّارے کے گرد گھومتے ہیں۔ اول تو اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیّاروں کا سُورج سے گہرا رشتہ ہے۔ اسکے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ جس مادّہ سے زمین بنی ہے اگر اس مادہ اور سُورج کے مادہ میں فرق ہوتا تو ہم یقین سے کہہ سکتے کہ زمین سُورج سے نہیں نکل سکتی

کیونکہ سُورج اور زمین کے مادہ میں فرق ہے۔ لیکن بات یہ نہیں ہے۔ سُورج کی بناوٹ میں بھی وُہی اجزا شامل ہیں جو زمین کی بناوٹ میں ہیں۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین سُورج کا ایک حصّہ ہی ہے حقیقت میں زمین اور سُورج کے مادہ میں کوئی فرق نہیں! علمِ طبعی کے ماہروں نے ہوا۔ پانی۔ مٹی۔ پہاڑ درخت۔ جاندار غرضکہ دُنیا کی ہر شئے کا امتحان اور تجزیہ کرکے یہ معلوم کیا ہے کہ دُنیا کی ہر چیز چند عناصر سے بنی ہوئی ہے جن کی تعداد ۹۸ ہے۔ کاربن۔ فولاد آکسیجن۔ فاسفورس۔ سیسہ اور ہائیڈروجن اُن میں سے چند ہیں۔ انہی عناصر کی کمی و بیشی اور ترکیب و ترتیب سے مختلف چیزیں بنی ہیں۔ چاہے وہ دھات ہو یا نباتات۔ آگ ہو یا پانی۔ مٹی ہو یا ہوا۔ قدیم زمانہ میں فلسفی لوگوں کا خیال تھا کہ عناصر ۵ ہیں۔ اور اہلِ اسلام تو صرف ۴ ہی بتاتے ہیں۔ لیکن آج علم اور سائنس کی ترقی سے ثابت ہو گیا ہے کہ قدماء کے یہ عناصر بھی مرکب ہیں اور کئی عنصروں سے مل کر بنے ہیں۔ مثلاً پانی دو عنصروں یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن نامی گیسوں کے خاص مقدار میں آپس میں ملنے سے بنتا ہے۔ اسی طرح ہوا میں بھی کئی عناصر پائے جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ایک نئے آلہ کی ایجاد ہوئی ہے۔ جسے سپیکٹروسکوپ کہتے ہیں۔ یہ دُنیا کے حیرت ناک آلات میں سے ایک ہے۔ اگر اس کے ذریعہ سورج کی روشنی کو دیکھا جائے تو ہر عنصر جو سورج میں موجود ہے اپنی اپنی جداگانہ روشنی اور رنگ کا نشان دیتا ہے۔ اور ان عناصر کی روشنی بالکل ویسی ہے جیسی کہ زمین کے عناصر کو جلانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح سپیکٹروسکوپ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کاربن۔ ہائیڈروجن۔ سوڈیم وغیرہ وہ تمام عناصر جنھیں ہم یہاں پر دیکھ اور تول سکتے ہیں سُورج اور دوسرے سیاروں و ستاروں میں

بھی موجود ہیں یہی نہیں کہ سپیکٹروسکوپ صرف ان آسمانی اجسام کے مادہ کو جاننے میں مدد دیتا ہے بلکہ ہم بتانا چاہتے ہیں کہ کس طرح اس کی مدد سے ایک نئے عنصر کی بھی دریافت ہوئی تھی جسے پہلے کوئی نہ جانتا تھا۔ سپیکٹروسکوپ سے معائنہ کرنے پر سورج کی شعاعوں میں ایک عنصر کی روشنی کا نشان ایسا نظر آتا تھا جو اُس وقت تک زمین کے عناصر میں دریافت نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس سے شک ہوا کہ شاید سورج میں زمین کی نسبت ایک عنصر زیادہ ہے۔ اس عنصر کا نام ہیلیم رکھا گیا۔ (ہیلوس یونانی زبان میں سورج کو کہتے ہیں) لیکن کچھ عرصہ ہوا ایک سائنسداں سر ولیم ریمزے نے ہیلیم کو ہوا میں سے گیس کی صورت میں ڈھونڈ نکالا۔ اس عنصر کی مقدار زمین پر اتنی کم ہے کہ اُس کی طرف پہلے کسی کا خیال ہی نہ گیا تھا۔ لیکن نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ سے سورج نے اپنی شعاعوں کے ذریعہ اس عنصر کا نشان ظاہر کر کے زمین پر اُسے ڈھونڈنے میں مدد دی۔ آجکل اس گیس سے ہوائی جہازوں کے بازو اور غبارے بھرے جاتے ہیں جس سے وہ ہوا میں بہت اونچے اُڑ سکتے ہیں۔ یہ گیس ہائیڈروجن گیس سے بھی ہلکی ہے اور اس کو آگ بھی نہیں لگتی۔

اب ہم اس مسئلہ پر ایک اور زاویہ سے غور کرتے ہیں۔ اگر ہم نظامِ شمسی کے تمام ممبروں پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس نظام کا مرکز یعنی سورج اتنا گرم ہے کہ اگر ہماری زمین موجودہ فاصلہ سے سورج کے کچھ ہزار میل بھی نزدیک چلی جائے تو زمین کی ہر چیز جل کر خاک ہو جائے۔ مشتری یعنی برہسپتی ستارہ سب ستاروں سے بڑا ہے۔ اور اتنا گرم ہے کہ یہ پگھلے ہوئے فولاد کی طرح گرم اور سُرخ ہو رہا ہے۔ ہماری زمین کی بیرونی سطح تو ٹھنڈی ہے لیکن اندر سے اب بھی از حد گرم ہے۔ کبھی کبھی اس گرمی کا اندازہ ہمیں آتش فشاں پہاڑوں کے

پھٹنے اور اندر سے گرم گرم مادہ کے نکلنے سے ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس چاند پر گرمی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ وہ بالکل ٹھنڈا ہے۔ اس کے پہاڑ بھی بنجر نظر آتے ہیں جس طرح مشتری اتنا زیادہ گرم ہے کہ اُس پر کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح چاند اتنا ٹھنڈا ہے کہ سردی کے باعث اُس پر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا

شاید یہ سب آپ کے لیے پُرانی کہانی ہو لیکن ہم ان سیاروں کے مختلف درجۂ حرارت کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ سُورج سب سے زیادہ گرم ہے۔ سب سے بڑا سیارہ ازحد گرم ہے لیکن سُورج جتنا نہیں۔ زمین جیسے چھوٹے سیارے باہر سے ٹھنڈے اور اندر سے گرم ہیں۔ سب سے چھوٹا چاند بالکل ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ یہ سب کیوں؟

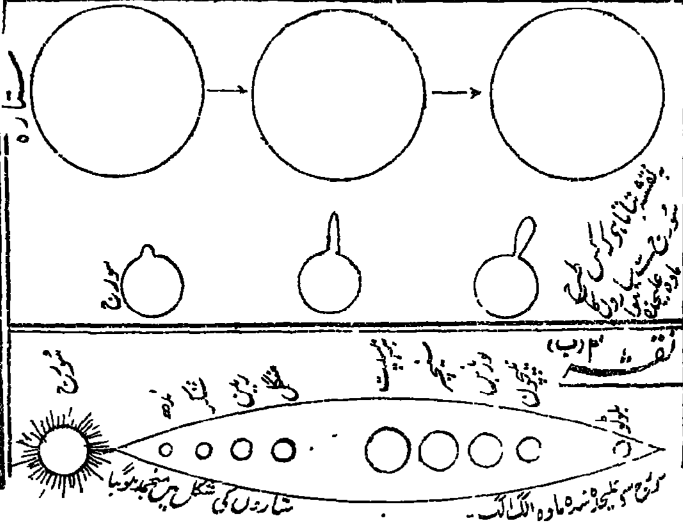
اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کبھی یہ سب موجودہ حالت سے کہیں زیادہ گرم اور جلتی ہوئی حالت میں تھے۔ کروڑوں برس سے یہ ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ سُورج اب بھی تیزی سے جل رہا ہے کیونکہ وہ بہت بڑا ہے۔ جتنی بڑی کوئی چیز ہوگی اُس کے ٹھنڈا ہونے میں بھی اُتنا ہی زیادہ وقت لگے گا مشتری سُورج سے بہت چھوٹا اور زمین سے بہت بڑا ہے۔ وہ نہ سُورج جتنا گرم ہے اور نہ زمین جتنا ٹھنڈا گو وہ بھی کبھی سُورج جتنا گرم تھا لیکن سُورج سے بہت چھوٹا ہونے کی وجہ سے سُورج کی نسبت ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ زمین جو مشتری سے بھی چھوٹی ہے باہر سے بالکل ٹھنڈی ہو کر منجمد ہو چکی ہے۔ لیکن ابھی اُس کے اندر پگھلا ہوا مادہ کھول رہا ہے۔ چاند زمین سے بھی بہت چھوٹا ہے وہ اندر تک بالکل ٹھنڈا ہو چکا ہے۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ دُوربین سے دیکھنے پر آسمان کے مختلف حصوں میں چمکتے ہوئے بادل سے نظر آتے ہیں جنھیں نیبولا کہتے ہیں۔ یہ نیبولا اتنے بڑے اور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کی لمبائی چوڑائی کو میلوں میں

قطعاً انسانی گرفت سے باہر ہے۔ جب اِن بادلوں کی روشنی کو سپیکٹروسکوپ سے دیکھا جاتا ہے تو ان میں بھی وہی عناصر پائے جاتے ہیں جو سُورج میں ہیں۔ اس سے ہی ظاہر ہے کہ کبھی ہمارا سُورج بھی کسی نیبولا کا ایک حصّہ تھا۔ جو عناصر سُورج میں پائے جاتے ہیں وہی ہماری زمین اور دیگر ستیاروں میں ہیں۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ ہماری زمین اور دیگر ستیاروں کا سُورج سے گہرا تعلق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ہمارا سُورج کسی نیبولا سے بنا۔ سُورج میں سے دوسرے ستیارے نکلے اور اُن ستیاروں سے حالات کے مطابق ایک یا کئی چاند علیحدہ ہوگئے !!

نظامِ شمسی کی پیدائش کے متعلق زیادہ تر سائنسدانوں کا خیال ہے کہ جس وقت سُورج مادہ کی گیس کی صُورت میں خلا میں چکر لگا رہا تھا تو ایک اور ستارہ گردش کرتا ہوا اُس کے پاس سے گذرا۔ وہ ستارہ سُورج سے بہت بڑا تھا۔ اس کی کشش سے سُورج کے مادہ میں زبردست ہل چل مچی۔ جیسے ہی وہ ستارہ سُورج کے قریب گھوم کر آگے بڑھا تو سُورج میں سے مادہ کے بادلوں کی ایک لہر اُٹھی اور اُس ستارہ کی طرف بڑھتی گئی حتّٰی کہ وہ مادہ کی لہر سُورج کے پاس سے کم چوڑی ہوکر سگار کی سی شکل میں علیحدہ ہوگئی۔ یہ لہر (دیکھو نقشہ ۱۲) درمیان میں چوڑی اور کناروں کی طرف سے پتلی تھی۔ ستارے کی کشش کے باعث مادہ کی یہ لہر سُورج سے الگ تو ہوگئی لیکن سُورج کی کشش اور ستارے کی حرکت کے اثر سے سُورج کے گرد گھومنے لگی۔ جس طرح بھاپ کو سردی پہنچے یا اس میں سے رفتہ رفتہ گرمی اِدھر اُدھر خارج ہوتی رہے تو وہ پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اُسی طرح لاتعداد عرصہ میں سُورج کا یہ حصّہ جو گیس کی حالت میں تھا رفتہ رفتہ گرمی کے منتشر ہونے سے ٹھنڈا ہونے اور سکڑنے لگا۔ آخر کار کھنچاؤ کے بڑھنے کے باعث اسی حصّوں

میں الگ ہو گیا۔ (گرمی سے مادہ پھیلتا ہے اور سردی یا گرمی کے کم ہو جانے سے سُکڑتا ہے) یہ الگ الگ حصے سیاروں کے جسم بن گئے۔ پہلے ان سب کا مادہ گیس کی صُورت میں تھا۔ کروڑوں برس میں رفتہ رفتہ گرمی کے کم ہوتے رہنے سے گیس کچھ سُکڑ کر اور ٹھنڈی ہو کر سیّال بنی۔ پھر گرمی کے بتدریج کم ہوتے رہنے سے نیم جامد اور بالآخر منجمد ہو کر ہمارے زمین اور ہمارے سیّاروں وغیرہ کی شکل میں تبدیل ہو گئی (دیکھو نقشہ ۴)۔ لیکن یاد رہے کہ مادہ کا جتنا بڑا کوئی جسم ہو گا اُتنا ہی زیادہ عرصہ اُس کے ٹھنڈا اور منجمد ہونے میں لگے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سُورج جو نظامِ شمسی میں سب سے بڑا ہے ابھی تک شدت سے جل رہا ہے۔ مُشتری جو اُس سے چھوٹا ہے نیم جامد حالت میں ہے۔ سینچر، نیپچون، یورینس وغیرہ نیم جامد ہی ہیں۔ زمین باہر سے ٹھنڈی اور اندر سے بہت گرم ہے۔ اور چاند اندر تک بالکل ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ سیّاروں کا مادہ چونکہ کسی ستارے کی کشش سے گھومتے ہوئے سُورج سے الگ ہوا تھا اور اس پر دو طرفہ کشش کا اثر تھا اس لیے یہ مادہ اپنے گرد بھی گھومنے لگا



یہی وجہ ہے کہ تمام سیارے اور تقریباً تمام چاند بھی ایک ہی طرف کو یعنی پورب سے پچھم کو گھومتے ہیں

زمین کی عمر

چند صدیوں پہلے دنیا کی تاریخ تقریباً ۳۰۰۰ برس تک کی معلوم تھی۔ اس سے پہلے کیا ہوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ صرف قیاس اور کہاوتیں تھیں جن کا کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا کو خدا نے اچانک ۴۰۰۴ برس قبل از مسیح بنایا تھا۔ یہ غلط خیال بائبل کی بنا پر پیدا ہوا تھا اسی طرح یہودی اور اہل اسلام بھی مانتے چلے آئے ہیں۔ یہ صحیح طور پر بتانا کہ زمین کب پیدا ہوئی تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن یہ تو ثابت ہو ہی چکا ہے کہ ہماری دنیا کی عمر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ عمل ریڈیم Radio-activity کے ذریعہ یہ ممکن ہو سکا ہے کہ زمین کی عمر کے متعلق کسی پختہ ثبوت کی بنا پر رائے قائم کی جا سکے۔ چنانچہ بڑی کوشش اور تجربہ کے بعد اندازہ لگایا گیا ہے کہ زمین کو سورج سے علیحدہ ہوئے دو ارب ۲,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ برس سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں۔

زمین پر زندگی کے آثار

سارے نظام میں جانداروں کا پتہ اب تک صرف زمین پر ہی ملتا ہے۔ اور زمین میں بھی ۳ میل کی گہرائی کے بعد جاندار نہیں ملتے۔ اسی طرح زمین سے اوپر ہوا میں پانچ میل کے بعد زندگی نہیں ملتی اسکے بعد تمام جگہ خالی اور خاموش ہی نظر آتی ہے۔

زمین کی رفتار

زمین اپنے محور پر نہایت تیزی سے گھوم رہی ہے۔ اس کی رفتار

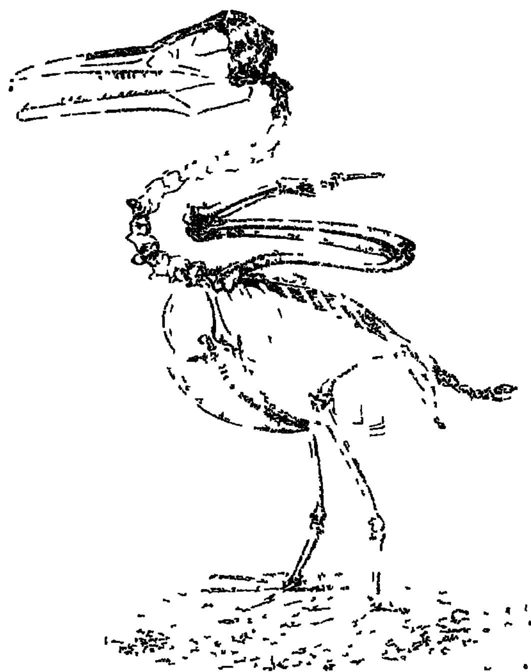
۵۰۰ ا فٹ فی سیکنڈ ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اس سے دُور نہیں گرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کے گھومنے سے جو دُور پھینکنے کی طاقت پیدا ہوتی ہے وہ زمین کی کشش سے بہت کم ہے۔ اسی لئے ہم زمین کے ساتھ لگے رہتے ہیں اگر زمین کی رفتار بجلنستا سترہ گنا زیادہ ہو جائے تو دُنیا کی تمام چیزیں زمین سے اُڑ کر آسمان میں غائب ہو جائیں۔ کیونکہ رفتار کی تیزی سے پیدا شدہ پھینکنے کی طاقت زمین کی کشش سے بہت زیادہ ہو جائے گی جس کا زمین مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ مادہ کی یہ کشش ہی وہ طاقت ہے جو نہ صرف ہمکو زمین سے لگائے رکھتی ہے بلکہ زمین کو بھی خلا میں اُڑ جانے سے بچاتی ہے۔ قدرت کی اس طاقت کا اثر ہر جگہ موجود ہے۔ اگر یہ طاقت نہ ہوتی تو تمام کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ سُورج اپنی کشش سے۔ زمین اور دوسرے سیاروں کو کھینچے رہتا ہے۔ سیاروں کی کشش بھی ایک دوسرے پر اثر کرتی ہے۔ اسیطرح سیارے اپنے چاندوں کو کھینچے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی اس باہمی کشش کے باعث ہی یہ سب اپنی اپنی جگہ گھوم رہے ہیں۔



جانداروں کی پیدائش

پچھلے باب میں ہم نے نظامِ شمسی کی پیدائش کا بیان کیا ہے۔ کائنات قدرت میں بننے اور بگڑنے کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے۔ کہیں کوئی دنیا بن رہی ہے تو کہیں بگڑ رہی ہے۔ دوربین اُٹھا کر جدھر دیکھو اُدھر کارسازِ حقیقی کی صنعت کا نمونہ نظر آجاتا ہے۔ ستارے اتنے بڑے بڑے کہ ہمارے سورج جیسے لاکھوں ان میں سما جائیں۔ نیبولا اتنے وسیع اور لمبے چوڑے کہ ایک ایک نیبولا سے سینکڑوں ستارے بنتے ہیں۔ نظامِ عالم کی کہیں حد ہی نہیں ملتی۔ جہاں تک دوربینی نظر جاتی ہے لامحدود خلا ہی خلا یا ستارے نظر آتے ہیں۔ ان کروڑوں ستاروں میں سے ایک ہمارا ناچیز آفتاب بھی ہے۔ اس کے گرد ہماری ننھی سی دنیا چکر لگا رہی ہے۔ لیکن اس چھوٹی سی دنیا کا ناچیز باشندہ انسان سمجھتا ہے کہ کائنات کا مرکز میں ہی ہوں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ذرّہ کے برابر بھی اس کی ہستی نہیں۔ بحر ناپیدا کنار میں چیونٹی سے زیادہ اوقات نہیں!

زمین کے وجود میں آنے کے بعد انسان۔ جانور اور پودوں کی پیدائش کیسے ہوئی۔ اس کے متعلق مختلف مذاہب نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ انجیل کا قول ہے کہ خدا نے پہلے چار دن میں دنیا کی تمام چیزوں کو بنا کر پانچویں اور چھٹے روز جانداروں اور انسان کو پیدا کیا۔ قرآن کا فرمان ہے کہ خدا وند تعالیٰ نے کُن کے کہنے سے زمین۔ آسمان۔ نباتات۔ اور جانداروں کو ایک دم بنا ڈالا۔ خاک کا پُتلا بنا کر اس میں رُوح پھونک دی اور اس کا نام آدم رکھا۔ آریہ بتاتے



دانتوں والے پرندیکا ڈھانچہ یہ پرندہ آج سے لاکھوں برس پہلے اِس دُنیا میں موجود تھا۔

تصویر متعلقہ مضمون صفحہ ۴۳



ایک پورے قد کا ڈپلوڈوکس یہ ماڈل اسکے ڈھانچہ کو دیکھکر بنایا گیا ہے۔

ہیں کہ جوان مرد اور جوان عورتیں نیز تمام قسم کے جاندار جوانی کی حالت میں زمین پھوڑ کر باہر نکل آئے۔ جسے وہ امیتھنی سرشٹی کے نام سے پکارتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کی بھی اسی قسم کی عجیب وغریب روایتیں ہیں۔ ان سب کا عقیدہ ہے کہ جو جاندار آج نظر آتے ہیں ابتدا میں بھی ویسے ہی تھے۔ ان سب کی نسلیں الگ الگ ہیں۔ نیز انسان اور جانور ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوئے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان کے آنے سے لاکھوں برس پہلے بھی ہزاروں قسم کے جانور موجود تھے۔ ان میں سے کئی جانوروں کی نسلیں عرصہ ہوا ختم بھی ہو چکی ہیں۔ اُن کی موجودگی کا ثبوت وہ نشانات ہیں جو صفحۂ ہستی پر چھوڑ گئے ہیں جنہیں قدرت نے اب تک بڑی احتیاط سے اپنے تہ خانوں میں محفوظ رکھا ہوا تھا۔ سائنسدانوں نے برسوں کی کوشش اور تحقیق کے بعد ان نشانات کو زمین کی گہرائیوں میں سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ قدرت کی کتاب زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق کو ایک ایک کر کے اکٹھا کیا ہے۔ انہی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جانور کیسے تھے؟ کتنے بڑے تھے؟ اور کس قسم کے تھے؟ اُن کے پاؤں کے نشانات اُن کی ہڈیوں کے ڈھانچے موجودہ زمانہ کے کسی جانور سے بھی نہیں ملتے۔ ڈپلوڈوکس کے ڈھانچے (جو اسّی فٹ لمبا جانور تھا) امریکہ میں ایک چٹان کے نیچے دبے ہوئے ملے ہیں۔ یہ ڈھانچے وہاں لاکھوں برس سے دبے ہوئے تھے۔ ریتلی چٹانوں میں قدیم زمانہ کی کئی قسم کی مچھلیوں۔ رینگنے والے جانوروں اور دانتوں والے پرندوں کے ڈھانچے بھی پائے جاتے ہیں۔ سلیٹ جیسی اور ریت کی چٹانوں میں ہڈیاں۔ ڈھانچے۔ ریشے۔ پودے۔ پھل۔ پاؤں اور لہروں کے نشانات حتیٰ کہ بارش کی بوندوں کے نشانات تک کثرت سے ملتے ہیں۔

ان سب نشانات یا ڈھانچوں کو جو مختلف قسم کی چٹانوں سے نکلتے ہیں فاسلز

(Fossils) یا پتھرائی ہوئی ہڈیاں کہتے ہیں۔ بڑے بڑے عجائب گھر ان لاکھوں برس کے پرانے فاسلز سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن سوال یہ اُٹھتا ہے کہ جو جانور کبھی زمین کی سطح پر چلتے پھرتے تھے زمین میں میلوں نیچے کیسے پہنچ گئے اُن کے جسم کی ہڈیاں اور ڈھانچے کس طرح لاکھوں برس تک ان چٹانوں میں محفوظ رہ سکے؟

اسے سمجھنے کے لئے ہمیں آج سے اربوں برس پہلے کا خیال کرنا ہوگا۔ جبکہ زمین پگھلے ہوئے مادہ کی شکل میں تھی۔ اور چاند کو علیحدہ ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا۔ زمین اپنے گرد نہایت تیزی سے گھوم رہی تھی۔ زمین میں اتنی گرمی تھی کہ اس کا مادہ کھول رہا تھا۔ اور آگ کی طرح چمک رہا تھا۔ یہ رقیق مادہ کشش مرکزی سے رُکا ہوا تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا زمین کے مادہ کی گرمی خلاء میں پھیلتی گئی۔ اس کا بیرونی حصہ جگہ جگہ سے ٹھنڈا ہو کر جمنے لگا۔ مادہ کے وزنی عناصر مثلاً سونا۔ چاندی۔ تانبا۔ لوہا وغیرہ زمین کے اندر مرکز کی طرف بیٹھنے لگے۔ اور ہلکے عناصر مثلاً ہیلیم۔ ہائیڈروجن۔ آکسیجن۔ نائٹروجن وغیرہ سطح پر رہے۔ اور رفتہ رفتہ اُن کے آپس میں مل جانے سے یہ فضا بن گئی۔ زمین اتنی گرم تھی کہ پانی صرف بھاپ کی شکل میں فضا میں چکر لگا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ زمین کے ہر چہار طرف نارنگی کے چھلکے کی طرح مادہ کی پپڑی جم گئی جو کئی میل موٹی تھی۔ لیکن اندر کا مادہ کھول رہا تھا اور اس میں ایسے ہی اُبال اُٹھتے تھے جیسے اُبلتا ہوا پانی اُچھلا کرتا ہے۔ زمین کا بیرونی پرت ابھی سخت نہیں بلکہ نرم تھا جگہ جگہ سے ٹوٹ جاتا تھا اور اُن میں سے مادہ باہر اُبل آتا تھا چٹانوں کے بڑے بڑے ٹکڑے کھولتے ہوئے مادہ میں اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ مادہ کی حرکت سے زمین کی یہ نرم تہہ کہیں سے اونچی کہیں سے نیچی ہوتی رہتی تھی۔ اس تہہ کے جم کر موٹا ہونے میں لاتعداد

عرصہ لگا۔ زمین کے ٹھنڈا ہو کر جمنے اور سُکڑنے سے زمین کی سطح پر جُھریاں پڑ گئیں جنھیں ہم پہاڑ کہتے ہیں۔ جوں جوں زمین اور ٹھنڈی ہوتی گئی اُس کی بیرونی شکل بھی بدلتی گئی۔ آخر کار وہ زمانہ آیا کہ بھاپ بادلوں کی شکل میں تبدیل ہو گئی اور پہلی مرتبہ زمین پر گرم پانی کی بارش ہوئی۔ پانی گرتے ہی زمین کی گرمی کے باعث پھر بھاپ بن کر فضا میں پھیل گیا۔ رفتہ رفتہ وہ زمانہ آیا کہ تمام کا تمام پانی بھاپ کی شکل میں تبدیل نہ ہو سکا۔ اور زمین پر گرم پانی کے دریا اور نالے بہنے لگے۔ زمین اتنی ٹھنڈی ہو چکی تھی کہ گرم ہوا اور بارش کے طوفان چلنے لگے اُس وقت چاروں طرف میدان اور پہاڑ بنجر تھے۔ دریا اپنے ساتھ اُنچائی سے مٹی ریت بہا کر اُن گہرائیوں میں لے جانے لگے جنھیں ہم سمندر کہتے ہیں۔ اس طرح زمین کا اوپر کا چھلکا تو جم گیا۔ جو تقریباً ۲۵ میل موٹا ہے لیکن اندر اب بھی پگھلا ہوا گرم مادّہ موجود ہے۔ کانوں کے اندر جانے سے تجربہ کیا گیا ہے کہ ہر پچاس فٹ کی گہرائی میں جانے پر حرارت ایک درجہ فارن ہائیٹ بڑھتی جاتی ہے۔ کولار کی سونے کی کان صرف آدھا میل گہری ہے۔ لیکن وہاں سخت گرمی ہے۔ دو تین میل نیچے اتنی گرمی ہے کہ وہاں انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی حساب سے چند میل اور نیچے پتھروں اور چٹانوں کو پگھلانے کے لئے کافی گرمی ہے یہی سبب ہے کہ کوہ آتش فشاں کے دہانوں سے پگھلا ہوا پتھر یا لاوا۔ راکھ اور بھاپ نکلتی ہے جس وقت زمین میں سے یہ مادہ باہر نکلتا ہے تو اُس کے زور اور مادہ کی حرارت سے زمین ایسی ہلنے لگتی ہے جیسے اُبلتے ہوئے پانی کی دیگچی پر رکھا ہوا ڈھکنا بھاپ کے دھکے سے اُٹھنے لگتا ہے۔ جب آتش فشاں پہاڑوں سے مادہ نکل چکتا ہے تو اُن کے آس پاس کی زمین یا تو اُونچی ہو جاتی ہے یا اور نیچے دھس جاتی ہے۔ زلزلہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ زمین کا ٹھوس حصہ بالکل قائم یا جکڑا ہوا نہیں ہے۔

زلزلہ سے زمین ہلتی اور اونچی نیچی ہونے لگتی ہے بلکہ بعض اوقات پھٹ بھی جاتی ہے۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں جاپان میں زبردست زلزلہ آیا تھا۔ اس حادثہ کے بعد معلوم ہوا کہ سمندر کی تہہ کے اُبھر آنے سے نئی زمین نکل آئی ہے۔ اور خشکی کا کچھ حصّہ نیچے ہو کر سمندر میں ڈوب گیا ہے زلزلہ سے پہلے خلیج ٹوکیو کہیں کہیں ۲۵۰۰ فٹ گہری تھی۔ زلزلہ کے بعد سمندر کی تہہ اتنی اُبھر آئی کہ ۵۰۰ فٹ سے زیادہ گہرائی نہ رہی۔ گویا وہاں کی زمین ۲۰۰۰ فٹ بلند ہو گئی ۱۸۹۹ء میں ہندوستان میں زلزلہ آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رن کچھ کے قریب زمین کا بہت بڑا حصّہ سمندر میں ڈوب گیا۔ زلزلوں کے علاوہ کئی جگہ دیکھا گیا ہے کہ کہیں تو زمین آہستہ آہستہ اوپر کو اُبھر رہی ہے اور کہیں رفتہ رفتہ نیچے دھنس رہی ہے چاہے اس کے اُبھرنے یا دھنسنے کی رفتار ہر سو سال میں دو تین انچ ہی کیوں نہ ہو۔ جاپان میں زمین بلند ہو رہی ہے لیکن اس کی بلند ہونے کی رفتار اتنی سست ہے کہ ظاہرہ محسوس نہیں ہوتی۔ مشہور سائنسداں چارلس لائیل نے پیمائش کر کے معلوم کیا ہے کہ سویڈن کا سمندری ساحل کچھ انچ سے لے کر چند فٹ تک ہر سو سال میں اُونچا ہو رہا ہے۔ اسی طرح جنوبی امریکہ میں پیٹے گونیا کی زمین بھی اونچی ہو رہی ہے۔ دوسرے سائنسدانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ گرین لینڈ کا علاقہ آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ رہا ہے۔

قدرت اسی طرح زمین کے مختلف حصّوں کو غرقاب کرتی یا اُبھارتی رہتی ہے۔ جزیروں اور سمندروں کے کنارے ڈوب جاتے ہیں اور نئے جزیرے نکل آتے ہیں۔ لنکا اور ہندوستان باہم کسی زمانے میں خشکی کے راستے ضرور ملے ہوئے تھے۔ دُنیا کے مختلف حصّوں میں اکثر سمندری گھونگھے اور سیپیاں وغیرہ سطح سمندر سے زیادہ بلند مقامات پر پائی گئی ہیں۔ دوسری طرف سمندر

کی تہہ میں ایسے آثار ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر کبھی جنگل تھے۔ سائبیریا میں جو کہ برفانی مُلک ہے مثل ہاتھی کے ڈیل ڈول والے برف کی تہوں میں دبے ہوئے ایسے جانوروں کے ڈھانچے مِلتے ہیں جو محض گرم خطّوں میں ہی زندہ رہ سکتے تھے۔

انگلینڈ میں بلوا پتھروں کی چٹانوں میں بانس۔ کھجور اور مونگے کے فاسلز پائے جاتے ہیں جن کا کہ وہاں ان دنوں نام ونشان تک نہیں۔ بلوچستان کے خشک خطّے میں بڑے بڑے گھڑیالوں کے فوسل پائے گئے ہیں۔ یہ باتیں بخوبی ثابت کرتی ہیں کہ مذکورہ بالا ملکوں کی حالت اور آب وہوا اُن دنوں کچھ اور ہی ہوگی۔ ۱۹۲۴ء میں جو سیّاح مونٹ ایورسٹ کی تلاش میں گئے تھے اُنھوں نے وہاں بحری جانوروں کے فاسلز دیکھے۔ اس سے پورے طور پر ثابت ہوتا ہے کہ کبھی وقت ہمالیہ کا وہ حصّہ ضرور سمندر کے نیچے غرقاب تھا۔

جب زمین کا دل پتلا تھا اور اس کا مادہ بھی زیادہ گرم تھا تو مادہ کی حرکت اور اُبال سے زلزلے بھی بہت زیادہ آتے ہوں گے۔ جگہ جگہ آتش فشاں پہاڑ مادّہ اُگلتے ہوں گے جس سے موجودہ زمانہ کی نسبت اُس وقت بار بار کہیں زمین اُبھرتی ہوگی، تو کہیں بیٹھتی ہوگی۔

زمین پر لاکھوں برس تک ایسی ہی زبردست تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اُونچائی کی جگہ میدان اور میدانوں کی جگہ بلندیاں بنتی رہی ہیں۔ زمین جوں جوں ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے، ایسی تبدیلیاں بھی کم ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی ۱۸۹۷ء میں آسام میں زلزلہ آیا۔ جس سے کہیں تو زمین ۳۵ فٹ تک اونچی ہوگئی اور کہیں کہیں اتنے ہی فٹ نیچے بیٹھ گئی۔ اس کے دو ہی سال بعد یعنی ۱۸۹۹ء میں الاسکا میں زلزلہ کے بعد زمین ۴۷۰ فٹ اونچی ہوگئی۔ یہ بات انسانی علم میں

ہے کہ زمین کی شکل وصورت میں وقتاً فوقتاً سینکڑوں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں یعنی لاکھوں برس پہلے جو زمین کا نقشہ تھا وہ آج نہیں ہے۔ کبھی افریقہ کے ساحل جبرالٹر پر یورپ سے ملے ہوئے تھے۔ اور ایشیا اور شمالی امریکہ بھی آبنائے بہرنگ کے مقام پر جڑے ہوئے تھے جس سے ایشیا سے شمالی امریکہ یا افریقہ سے یورپ تک خشکی پر ہی سفر کرنا ممکن تھا۔

اب ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ وہ جاندار جو کبھی سطح زمین پر رہتے تھے چٹانوں کی تہوں میں کیسے دب گئے۔ کسی دریا کو طغیانی کے وقت دیکھو تو اس کا پانی بہت گدلا معلوم ہوتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بہاؤ کے ساتھ پہاڑوں اور میدانوں سے بے شمار مٹی بہہ آئی ہے۔ جو مٹی پہاڑوں سے آتی ہے وہ کسی نہ کسی طرح سمندر تک ضرور پہنچ جاتی ہے۔ جب کوئی دریا سمندر کے پاس پہنچتا ہے تو اس کی رفتار بہت کم ہو جاتی ہے۔ پانی کے بہاؤ کے کم ہو جانے سے مٹی آسانی سے نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ اور اس طرح مٹی کے پڑتے رہنے سے وہ جگہ اونچی ہوتی رہتی ہے جس سے سمندر کے کنارے نئی زمین بننے لگتی ہے۔ اسے ہم ڈیلٹا کہتے ہیں۔ دریائے برہم پُتر اور نیل جس جگہ سمندر سے ملتے ہیں وہاں ایسے کئی ڈیلٹے بن گئے ہیں۔ دریا کے پانی کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس کی رَو میں صرف مٹی اور ریت ہی نہیں بلکہ گھاس۔ پتے۔ درختوں کی شاخیں اور مردہ جانوروں کی لاشیں وغیرہ بھی بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ سب بہہ کر جب سمندر کے پاس پہنچتی ہیں تو وہاں کی دلدلی مٹی میں پھنس جاتی ہیں۔ جب دریا کا پانی کم ہو جاتا ہے تو گیلی مٹی پر جانور بھی گھومنے لگتے ہیں۔ اُن کے پاؤں کے نشانات مٹی پر بن جاتے ہیں اگر کوئی ڈپلوڈوکس جیسا بڑا اور وزنی جانور اُس دلدل میں پھنس جاتا ہے تو اپنے

وزن کی وجہ سے وہ دلدل میں گہرا دھنس جائے گا۔ سورج کی گرمی دلدل کو سکھا دے گی۔ اب دوبارہ جب دریا میں طغیانی آئے گی تو اس سوکھی ہوئی دلدل پر اور مٹی چڑھتی جائے گی۔ خیال رہے کہ اسی دلدل میں وہ سب چیزیں بھی دبی ہوئی ہیں جو پانی کے ساتھ بہہ آئی تھیں۔ بالفرض اُس حصّہ کی زمین یا سمندر کی تہہ نیچے کو دھنس رہی ہے۔ تو دریا اُس ڈیلٹے یا سمندر کے کنارے پر متواتر مٹی ڈالتا رہے گا۔ اس نئی مٹی کا بوجھ بھی پہلے والی مٹی کی تہہ پر ہی پڑے گا اگر وہ زمین متواتر نیچے دھنستی رہے تو مٹی یا ریت کی تہہ پر تہہ بچھتی چلی جائے گی یہاں تک کہ سینکڑوں برس تک ایسا ہی ہوتے رہنے سے کسی ایک قسم کی مٹی کی خوب موٹی تہہ جم جائے گی۔ اتنے میں زمین کی اندرونی حرکات یا دوسرے اسباب کے باعث دریا کی رفتار اور راستہ دونوں بدل جائیں تو وہ دوسری قسم کی مٹی بہا کر لانے لگے گا۔ اگر پیشتر چکنی مٹی کی تہیں تھیں تو اب بجری کی تہیں جمنے لگیں گی اوپر کی تہوں۔ پانی کے دباؤ اور زمین کی گرمی سے سب سے نیچے کی تہیں سخت ہو کر چٹان کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گی۔ لوہے اور چونے کے ذرات جو پانی میں ہوتے ہیں اس کام میں بجنسہٖ اسی طرح مدد دیتے ہیں جیسے عمارت بناتے وقت چونا پتھروں کو جوڑتا ہے۔ یعنی وہ اجزا کو جماتے اور پرتوں کو سخت کر دیتے ہیں اگر سمندر کی تہہ متواتر دھنستی رہے تو کہیں ہزاروں فٹ اور کہیں اس سے بھی زیادہ موٹی تہیں بن جاتی ہیں۔ ریتلی مٹی کا ریتلا پتھر اور چکنی مٹی کا سلیٹ پتھر بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ حصّے جو کبھی مٹی کی تہیں تھیں سمندر کی تہہ میں ڈھانچوں سمیت اور گھونگھوں سمیت چٹانیں بن جاتی ہیں۔ پھر جب کبھی سمندر کی تہہ زمین کی اندرونی حرکات کی وجہ سے اُوپر اُبھرنے لگتی ہے تو وہ حصہ جس پر کبھی پانی تھا خشکی بن جاتا ہے۔ زمین کے اس طرح اُبھرنے سے مٹی کی سب سے نیچے کی تہیں بھی جو چٹانیں بن گئی تھیں اوپر

آجاتی ہیں۔ سینکڑوں برس میں پانی۔ پالا۔ برف۔ دھوپ اور ہوا کے اثر سے رفتہ رفتہ چٹانوں کے اوپر کی وہ مٹی جو چٹان نہ بن سکی تھی ہٹتی اور ڈھلتی جاتی ہے اس طرح لاکھوں برس پہلے کی دبی ہوئی چیزیں ابھر اوپر آجاتی ہیں۔ جب انسان ان پہاڑوں یا چٹانوں کو اپنے مکانات اور سڑکیں وغیرہ بنانے کے لئے توڑتا ہے تو یہ قدیم زمانہ کے نشانات یا فاسلز نمودار ہو جاتے ہیں۔

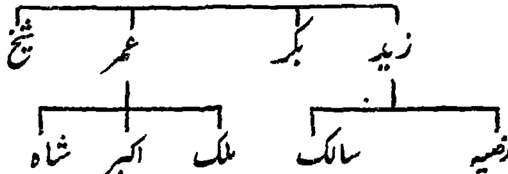
چٹانی کتابیں

چٹانیں گذرے ہوئے زمانہ کی تواریخ کی کتابیں ہیں۔ ان کے ذریعہ ہم زمین کی پوری تاریخ معلوم کر سکتے ہیں۔ اور اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کب بنی۔ اس میں کب کب کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ کیسے کیسے جاندار و نباتات اس پر موجود تھے۔ چٹانیں اور مٹی کی تہیں اُن کے اوراق ہیں ان میں دبے ہوئے فاسلز یا نشانات ان کتابوں کے حروف ہیں۔ بہت سے انسانوں (ماہران علم الارض) نے ان کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے میں تمام عمر صرف کر دی ہے۔ چٹانوں کی کتابیں ہمیں پرانے زمانے کے حالات بتاتی ہیں لیکن یہ کسی کتاب کے اوراق کی طرح سلسلہ وار نہیں پائی جاتیں۔ وجہ یہ کہ زمین کی اندرونی حرکات نے انھیں تہ و بالا کر دیا ہے۔ مگر چند ایسی پہچانیں اور طریقے ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں چٹان کس وقت کی ہے؟ آیا یہ چٹان دُنیا کی تاریخ میں سب سے پہلے بنی تھی یا بعد میں؟ سب سے پُرانی چٹانوں میں جنھیں آتشی چٹانیں Azoic Rocks کہتے ہیں کسی قسم کے بھی جاندار کے فاسلز یا نشانات نہیں ملتے۔ کیونکہ جب یہ چٹانیں بنی تھیں اُس وقت زمین پر زندگی موجود نہ تھی۔ سب سے پہلے زندگی کے آثار اُن چٹانوں میں سے ملتے ہیں جو

ریت مٹی اور بجری سے بنی تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ زندگی ابتدا میں سمندر یا پانی میں پیدا ہوئی تھی۔ سب سے نیچے والی ریتلی چٹانوں میں چھوٹی چھوٹی مچھلیوں عجیب عجیب قسم کے پودوں۔ اور درختوں کے نشانات ملتے ہیں۔ ان کے اوپر کی چٹانوں میں ایسے جانوروں کے فاسلز ملتے ہیں جو خشکی اور پانی دونوں میں رہ سکتے تھے۔ اُن جانوروں کی قسم میں آج کل مینڈک۔ کچھوا۔ اودبلاؤ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعد کی چٹانوں میں رینگنے والے چھپکلی نما بڑے بڑے اور چھوٹے جانوروں کے فاسلز پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر اکتھیوسارس کے فاسلز زیادہ ملتے ہیں۔ یہ چھپکلی نما جانور ۴۰ فٹ سے بھی زیادہ لمبا تھا۔ بعد کی چٹانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جانور خشکی پر بھی رہنے لگے تھے۔ اس زمانہ کے جانوروں میں ڈنوسارس جو کچھ مچھلی اور کچھ چھپکلی سے ملتا جلتا تھا ۸۰ فٹ تک کی لمبائی کا تھا۔ اسی طرح ڈپلوڈوکس بھی ۷۰ سے ۸۰ فٹ کی لمبائی کے ملتے ہیں۔ سب سے بڑا جانور جو کبھی زمین پر رہ چکا ہے ایک قسم کی بہت بڑی چھپکلی تھی جس کی لمبائی ۹۰ فٹ سے بھی زیادہ اور اونچائی ۱۵ فٹ تک تھی۔ یہ تمام جانور آج سے بہت زمانہ پیشتر تقریباً بارہ کروڑ ۱۲۰,۰۰۰,۰۰۰ برس سے بھی پہلے زمین پر گھومتے پھرتے تھے۔ لیکن آج سے آٹھ کروڑ ۸۰,۰۰۰,۰۰۰ پہلے اس دُنیا سے ختم ہو گئے۔ ان قدیمی چٹانوں میں انسان کے موجود ہونے کا کہیں کوئی نشان نہیں ملتا۔ ہاں ان تہوں کے بہت اوپر سطح زمین کے بہت قریب انسانوں کے ڈھانچے اور انسان کی موجودگی کے نشانات ملتے ہیں۔ اس زمین میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے جانور۔ درخت اور پودے دبے ہوئے ہیں جنھیں انسان نے زندہ حالت میں کبھی نہیں دیکھا۔ یہ جانور ایک ہی وقت میں پیدا بھی نہیں ہوئے۔ مختلف قسم کے جانور ایکدوسرے

کے بعد ہی اس زمین پر آئے ہیں۔ کیونکہ زمین کی ہر تہہ میں ایک دوسرے سے مختلف قسم کے جانور بھی ملتے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے درختوں میں نہ تو پھول لگتے تھے اور نہ پھل۔ اسی باعث نہایت قدیم تہوں میں پتوں کے علاوہ پھولوں کے نشانات نہیں ملتے۔

جانداروں کے خاندان



مندرجہ بالا ایک خاندان کی تین پشت کا شجرہ ہے۔ شجرہ ایک قسم کا نقشہ ہوتا ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی خاندان کے ممبروں کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ عام طور پر ایک ہی کنبہ کے آدمیوں کی شکل و صورت ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ ضرور ملتی جلتی ہوتی ہے جس سے اندازہ ہو جایا کرتا ہے کہ شاید اُن کا آپس میں نزدیکی رشتہ ہے۔ اسے خاندانی مشابہت کہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ خاندانی مشابہت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایک بھائی کو دیکھنے سے دوسرے بھائی کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ کسی خاندان کے آدمی ایک دوسرے سے خواہ کتنے

ہی ملتے ہوں لیکن پھر بھی اُن کی شکل وصُورت اور خط وخال میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ جس سے ہر شخص انفرادی طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔ یہی بات اُن تمام بڑے خاندانوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جنھیں ہم قوم یا نسل کے نام سے پکارتے ہیں۔ جیسے ہندوستانی۔ چینی۔ جاپانی۔ انگریز وغیرہ بہت سی قومیں ہیں۔ اگرچہ کوئی بھی دو چینی ایک جیسی صُورت کے نہیں ہوتے۔ لیکن جب ہم کسی ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جس کی ناک چپٹی۔ بادام کی سی آنکھیں اور زرد رنگ ہو تو ہم فوراً کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ چینی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں ایک ہی قسم کی آنکھیں۔ رنگ اور چہرہ والے چینی ہیں۔ لیکن پھر بھی ہر چینی اپنی الگ الگ صُورت رکھتا ہے۔ ان تمام آدمیوں کو ہم چینی خاندان۔ یا چینی نسل کے ہی کہتے ہیں۔ یہی بات دوسری تمام اقوام کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

اب تمام نسلوں کی طرف غور کریں۔ جیسے گورے آدمی۔ زرد رنگ کے آدمی۔ سُرخ رنگ کے آدمی۔ کالے آدمی۔ اور گندمی رنگ کے آدمی۔ ہم ان سب کو آدمی ہی کہتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ان سب میں ایک طرح کی خاندانی مشابہت پائی جاتی ہے۔ کوئی بھی آدمی چاہے وہ پچھم کا ہو یا پُورب کا گورا ہو یا کالا چینی ہو یا جاپانی سب سیدھے ہو کر دو ٹانگوں کے بل چلتے ہیں۔ سب کی ٹانگیں سیدھی ہیں۔ سب کی کھوپڑیاں گول ہیں۔ سب کے سر اور چہرہ پر بال ہیں۔ یہ سب کے سب کوئی نہ کوئی زبان بولتے ہیں۔ یہ وہ چند مشابہتیں ہیں جن کی بنا پر ہم ان سب کو انسان سمجھتے ہیں۔ اگر تمام انسانوں کا شجرۂ نسب تیار کیا جائے تو کم از کم بحر الکاہل جتنے سمندر کے برابر لمبا چوڑا کاغذ اور ایک نہایت باریک نب کا قلم درکار ہوگا۔ اُس پر انسان کے آباواجداد کو سب سے اوپر لکھا جائے اور تمام خاندانوں یا نسلوں کا شجرہ نیچے لکھا جائے تو اتنا بڑا شجرہ لکھنے

کے لئے کئی ہزار برس درکار ہوں گے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ سیہ فام حبشی۔ زرد رُو چینی۔ سُرخ رنگ کے انڈین Red indian گندمی رنگ کے ہندوستانی اور گوری چمڑی والے انگریز یہ مختلف قسم کے آدمی ایک ہی خاندان کے ممبر ہیں۔ حالانکہ حبشی اور انگریز آپس میں دُور کے خون کے بھائی ہیں۔ پھر بھی یہ دونوں ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں؟ اسی رنگ کے اختلاف کی بنا پر گورے رنگ کا آدمی سمجھتا ہے کہ وہ کالے رنگ کے آدمیوں کو غلام بنا کر بازار میں فروخت کر سکتا ہے۔ بلکہ اُن کے ساتھ کبھی جانوروں سے بھی بدتر سلوک ہوتا تھا۔ ہندوستان میں اونچی ذات کے ہندو خود کو اعلیٰ سمجھ کر اپنے ہی جیسے انسانوں پر ظلم کرتے ہوئے نہیں ہچکچاتے۔ ہمیں اکثر خیال آتا ہے کہ اگر انسان کا سب سے پہلا بزرگ پھر زندہ ہو کر دُنیا میں آجائے اور اپنے خاندان کے بچوں کو دیکھے تو اُسے تعجب ہو کہ اُس کے پوتے پڑپوتے کتنے مختلف قسم کے ہو گئے ہیں۔

جس طریقہ سے انسان مختلف قوموں اور نسلوں میں تبدیل ہو سکتا ہے کیا اُسی طرح دوسرے جاندار اور نباتات بھی مختلف نسلوں میں تبدیل نہیں ہو سکتے؟ اس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ جانور اور پودے کبھی نہیں بدلتے کیونکہ کُتّے سے ہمیشہ کُتا ہی پیدا ہوتا ہے۔ کسی بھی درخت کا بیج بڑا ہو کر وہی درخت بنتا ہے۔ اور یہ تو ٹھیک ہے کہ انسان بہت سی قوموں میں بٹ گیا لیکن جانور اور نباتات تو بالکل ایک ہی نمونہ پر پیدا ہوتے آرہے ہیں۔ ایسی حالت میں ہمیں آپ کو بتانا ہے کہ جانور اور پودے بھی بدلتے ہیں۔ مثال کے طور پر کبوتر کو لیں۔ اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض قسمیں دوسری اقسام سے بالکل ہی نہیں ملتیں۔ یا ہو کو دیکھیں وہ اپنے سینہ کو کتنا پھُلا لیتا ہے۔ جیسے اُس کے

سینہ میں ربڑ کی گیند رکھی ہو۔ لگتا ہے کہ مور کی طرح دُم کے پروں کو پھیلا کر ناچتا ہے۔ جیکوبن Jacobin کی گردن کے چاروں طرف کیسے خوبصورت پر ہوتے ہیں۔ لوٹن کبوتر جو جنگلی کبوتر سے مختلف تو نہیں لیکن اُڑتے وقت ہوا میں قلابازیاں لگاتا ہے۔ اور چٹھی رساں کبوتر میلوں دُور سے اپنے گھر واپس آجاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بیسیوں قسم کے ایسے اور پرندے ہیں جن سب کو ہم کبوتر ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ چارلس ڈارون نے جن کے متعلق ہم اوپر کہیں ذکر کر آئے ہیں، کبوتروں کا نہایت غور سے مطالعہ کر کے یہ معلوم کیا ہے کہ یہ مختلف اور عجیب عجیب قسم کے تمام پرندے جنگلی کبوتر کی ہی اولاد ہیں۔ تمام قسم کے کبوتر جنگلی کبوتر کے ایسے ہی بچے ہیں جیسے چینی۔ اسکیمو، حبشی اور دوسرے سب قسم کے آدمی سب سے پہلے آدمی اور عورت کی اولاد ہیں۔ اسی طرح کتوں کو دیکھو، چینی کتا اتنا چھوٹا کہ بچہ بھی اپنے بغل میں دبا سکتا ہے۔ شیر کتا اتنا بڑا کہ اُس پر آدمی سواری کر سکتا ہے۔ ٹیریر Terrier تازی کتا۔ بلڈاگ وغیرہ سینکڑوں قسمیں ہیں۔ ان سب کو ہم کتے ہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ سب اُسی بھیڑیے نما جنگلی کتے سے نکلے ہیں جو کبھی وحشی انسانوں کے ساتھ شکار کھیلنے جایا کرتا تھا ہم نے جانوروں کے صرف دو خاندانوں کی مثالیں دی ہیں۔ اسی طرح ہر جانور کے متعلق خیال کرنے سے ظاہر ہو جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک کی کئی قسمیں ہیں اور وہ سب کسی ایک نسل کے جانور کی اولاد ہیں۔

پودوں کا بھی یہی حال ہے۔ دہلی کے سرکاری باغ میں جا کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ صرف گلاب کے پھول کی ہی سینکڑوں قسمیں ہیں۔ سرخ۔ سفید۔ زرد۔ گلابی۔ چھوٹا بڑا۔ جھاڑی دار اور بغیر کانٹے کا وغیرہ کئی طرح کے گلاب ہیں۔ گویا تمام پودے ایک دوسرے سے

کسی بات میں مختلف ہیں۔ لیکن یہ سب اُسی جنگلی گلاب سے نکلے ہیں۔ جو عام طور پر جھاڑیوں کی شکل میں جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ باغباں انہی گلاب کے پودوں سے نت نئی قسمیں نکالتے رہتے ہیں۔

آموں کی فصل میں کسی بڑے میوہ فروش کی دکان پر جا کر نظر ڈالیں تو آپ کو طرح طرح کے آم دکھائی دیں گے۔ اگر ایک طرف لنگڑے۔ سفیدے اور قلمی آم ہیں تو دوسری طرف مالدہ۔ سندوری۔ دسہری وغیرہ رکھے ہیں۔ ان سب کا ذائقہ اور خوشبو الگ الگ ہے۔ لیکن آموں کی یہ تمام قسمیں اُن جنگلی آم کے پیڑوں سے ہی نکلی ہیں جنھیں کھانے سے حلق تک کھٹا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر پھل پھول کے متعلق غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک کی مختلف قسمیں ہیں اور وہ کسی ایک ہی نسل سے نکلی ہیں۔

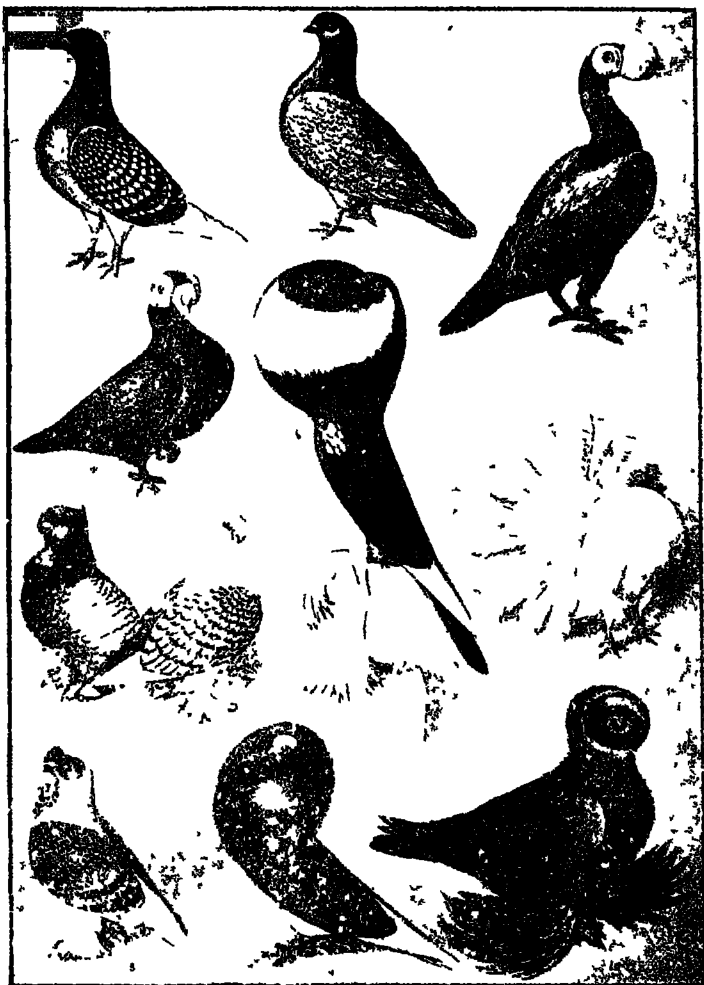
مصنوعی انتخاب

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنگلی گلاب سے اتنی قسمیں کیسے بن گئیں؟ اور اُن میں سے باغباں کیسے نئی نئی قسمیں نکالتے رہتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ یہ تمام تبدیلیاں ایک دم ہی نہیں ہو جاتیں۔ نئی نئی قسم کے گلاب جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ تبدیلیوں کی ابتدا اُس وقت سے شروع ہوئی جب پہلے پہل انسان نے جنگلی گلاب کو جنگل سے اُکھیڑ کر باغ میں لگایا جس سے وہ پودا کھلے میدان میں چلنے والی تیز ہواؤں اور طوفانوں کی زد سے بچ گیا۔ باقاعدہ پانی ملنے لگا کھاد ڈالی گئی۔ باغبان نے اس کی ایسے ہی پرورش کی جیسے ماں اپنے بچے کو پالتی ہے۔ تبدیلی آب و ہوا اور انسانی دیکھ بھال کے باعث اس میں رفتہ رفتہ تبدیلی آنے لگی۔ پودے کی نشو و نما اچھی ہونے سے پھولوں میں پہلے کی نسبت

زیادہ پنکھڑیاں نکلنے لگیں اور رنگ میں نکھار آنے لگا۔ باغبان ان پھولوں میں اُس پھول کو جس کی پنکھڑیاں سب سے بڑی جس کا رنگ سب سے شوخ اور خوشبو تیز ہے توڑ لیتا ہے۔ اُس میں سے بیج نکال کر دوسری کیاری میں بو دیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بیج پھوٹتے ہیں۔ پودے بڑے ہوتے ہیں اور وہ کیاری گلاب کے پھولوں سے مہک اُٹھتی ہے۔ مالی پھولوں پر نظر ڈالتا ہے۔ اُس پھول کو جو ان سب میں بڑا ہے چُن لیتا ہے۔ اِس پھول سے بیج لے کر دوبارہ نئی کیاری میں بو دیئے جاتے ہیں۔ جب اس دفعہ پھول نکلتے ہیں تو اُن میں سے بعض پودوں کے پھول اُس جنگلی گلاب سے بہت بڑے اور مختلف ہوں گے۔ اسی طریقہ سے بار بار بڑے سے بڑے اور رنگین گلاب کو چُن کر گلاب کی نئی نئی قسمیں پیدا کر لی جاتی ہیں۔ زرد گلاب تیار کرنے کے لئے ہر بار زیادہ سے زیادہ زردی مائل پھولوں کو چنتا ہوا چلا گیا۔ اور سُرخ بنانے کے لئے سب سے زیادہ سُرخ پھول چُنے گئے۔

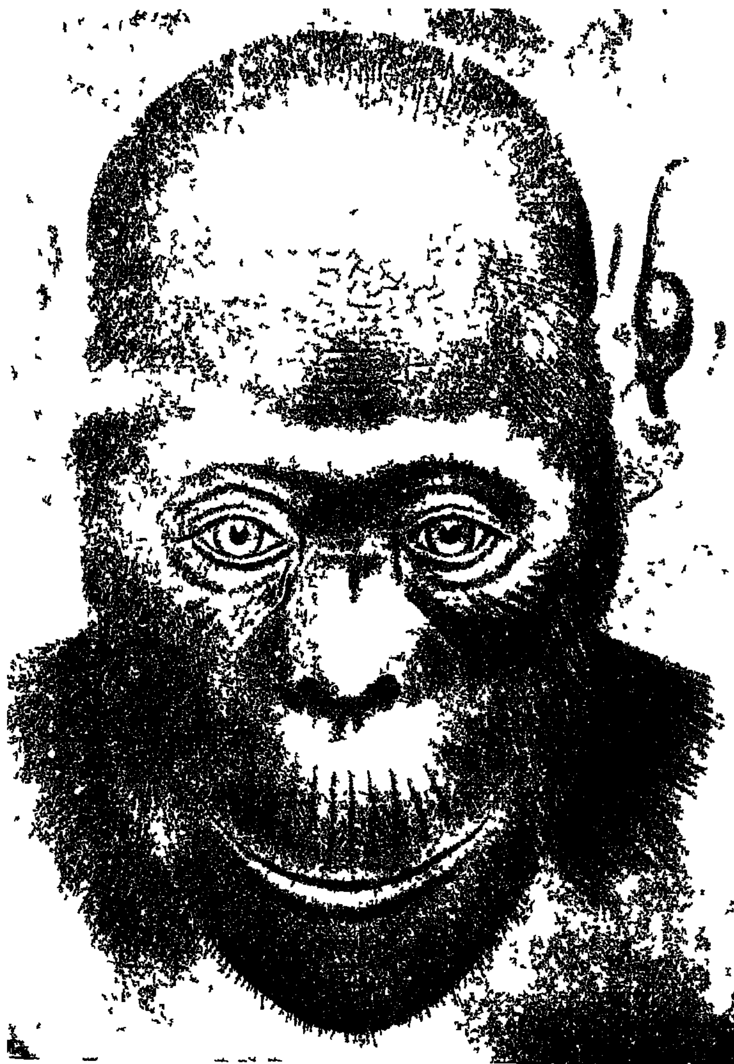
اسی طریقہ سے ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ کس طرح جنگلی کبوتر سے اتنی مختلف قسم کے کبوتر پیدا ہو گئے۔ بالفرض ایک کسان کسی جنگلی کبوتر کے جوڑے کو دانہ پانی دے کر ہلا لیتا ہے۔ اُن کے رہنے کے لئے گھونسلہ بنا دیتا ہے۔ جنگل سے مختلف ان نئے حالات میں اُن کے بچے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبوتروں کا ایک چھوٹا سا غول ہو جاتا ہے۔ یہ تمام کبوتر بالکل ایک جیسے نہیں ہوں گے بعض کے پروں کے رنگ مختلف ہوں گے تو بعض کی دُم اوروں کی نسبت کچھ بڑی ہوگی۔ یا بعض اُڑتے وقت قلابازیاں لگاتے ہوں گے وغیرہ۔ اب اگر وہ کسان بھی ان کبوتروں کے فرق کو محسوس کرے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھے کہ اُس کے پاس اتنے زیادہ کبوتر ہو گئے ہیں کہ وہ اُن سب کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ تو ایسی حالت میں جو کبوتر اُسے زیادہ پسند ہوں گے رکھ لے گا۔ اور

باقی پڑوسیوں کو دیدے گا یا پکا کر کھائے گا۔ بالفرض اُن کبوتروں میں سے جو اُس نے رکھ لئے ہیں ایک دو جوڑے ایسے بھی ہیں جن کی دم کے پر زیادہ بڑے اور اوپر کو اُٹھے ہوئے ہیں۔ جب یہ جوڑے بچے دیں گے تو اُن میں بڑے ہونے پر بعض بچوں کی دُم کے پر اپنے ماں باپ کی طرح اُٹھے ہوئے ہوں گے۔ کبوتروں کی تعداد کے دوبارہ بڑھ جانے پر جب وہ کسان کبوتروں کو کھاتا یا پڑوسیوں کو دیتا ہے تو وہ اُن کبوتروں کی جن کی دُم کے پر سب سے زیادہ اُٹھے ہوئے ہیں رکھ لے گا۔ اب اسی طرح وہ بار بار کرتا رہے اور اُن کبوتروں کو جن کی دُم اُٹھی ہوئی ہو رکھتا رہے تو کچھ برسوں کے بعد اُس کے پاس لقا کبوتر کے کئی جوڑے ہو جائیں گے جو مور کی طرح دُم پھیلا کر ناچتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ انسان نے جنگلی کبوتروں سے طرح طرح کے کبوتر پیدا کر لئے اسی طریقہ سے لیکن ذرا مختلف ڈھنگ کے ساتھ یاہو کبوتر پیدا ہو گئے۔ کبوتر باز نے دیکھا کہ اُس کے بعض کبوتروں کی عادت ہے کہ وہ غٹرغوں کرتے وقت گردن کو بھی پھلا لیتے ہیں۔ اس پر وہ اُنھی کبوتروں کو چُنتا گیا جو اپنی گردن کو سب سے زیادہ پھلاتے تھے۔ اسی طرح وہ بار بار چُنتا رہا حتیٰ کہ یاہو کبوتر پیدا ہو گیا جو اپنی گردن کو اتنا پھلا لیتا ہے جیسے اُس نے ربڑ کی گیند نگل لی ہو۔ آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے انسان نے کبوتروں کا انتخاب شروع کیا تھا۔ اور آج وہ دن ہے کہ اس انتخاب کی بدولت کبوتروں کی سینکڑوں قسمیں دُنیا میں نظر آتی ہیں۔ تمام پالتو جانوروں ۔ باغیچی پھولوں اور درختوں کی مختلف قسمیں ابتدائی جنگلی نسلوں انسان کی کوشش سے ہی پیدا ہوئی ہیں۔ جنگلی جھاڑیوں۔ درختوں اور جانوروں میں سے انسان نے ایسی خاص خاص قسموں کو چُن لیا جو کسی نہ کسی صورت میں مفید ثابت ہوئیں۔ یا اُسے پسند آئیں۔ یہاں تک کہ



کبوتروں کی چند قسمیں:- تمام قسم کے کبوتر جنگلی کبوتر ہی کی اولاد ہیں۔

تصویر متعلقہ مضمون صفحہ ۵۸



گنجا چمپانزی :- اس کی شکل و صورت انسان سے کتنی ملتی ہے؟

تصویر متعلقہ صفحہ نمبر ۹۰

اُن خاص قسموں کے سوا کچھ نہ رہا۔ ان قسموں کے چننے کو اصطلاح میں مصنوعی انتخاب Artificial Selection کہتے ہیں مصنوعی انتخاب کے معنی یہ ہیں کہ جانوروں اور پودوں کی ان نئی قسموں کو عالم وجود میں لانے میں انسان کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ فی زمانہ دُنیا میں جتنی بھی پالتو جانوروں۔ باغیچی پودوں اور درختوں کی قسمیں نظر آرہی ہیں وہ تمام کی تمام مصنوعی انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ انسان دُنیا میں نئی نئی قسموں کے پالتو جانور اور پودے لاتا رہا ہے اور لاتا رہے گا۔

ہم ایک عجیب واقعہ پیش کرتے ہیں جس میں گو براہِ راست انسان کا ارادہ مصنوعی انتخاب کا نہ تھا۔ لیکن اُس کا نتیجہ یہی نکلا۔ رُوس میں گیہوں کے پودوں کے ساتھ ایک قسم کا گھاس بھی اُگ آتا تھا۔ جو گیہوں کی فصل کو نقصان پہنچاتا تھا۔ فصل کٹنے پر اس گھاس کے بیج گیہوں میں ملجاتے تھے۔ ان بیجوں کو گیہوں سے علیحدہ کرنے کے لئے اُنھیں ایسی چھلنی میں سے چھاننا پڑتا تھا جس میں سے گیہوں کے دانے تو چھن جائیں لیکن اس گھاس کے بیج جو گیہوں سے بڑے تھے نہ چھن سکیں۔ بعد میں اسی گیہوں کو آئندہ فصل کے لئے کھیتوں میں بویا جاتا تھا۔ چند سالوں کے بعد کھیتوں میں گیہوں کے ساتھ ایک نئی قسم کی گھاس اُگنے لگی۔ اس کے بیج پہلے والی گھاس کے بیجوں سے بہت چھوٹے تھے۔ تحقیقات کرنے پر معلوم یہ ہوا کہ چھلنی میں سے گھاس کے بڑے بیج تو چھنتے نہ تھے۔ لیکن وہ بیج جو غیر معمولی طور پر چھوٹے ہوا کرتے تھے گیہوں کے ساتھ چھن جاتے تھے۔ اس لئے صرف چھوٹے بیجوں سے ہی گھاس پیدا ہونے لگی۔ اس نئی گھاس کے بیج اور بھی چھوٹے ہوتے گئے۔ کیونکہ اگر کسی پودے کے بیج بڑے بھی ہوئے تو وہ چھلنی میں

سے چھُن نہ سکتے تھے۔ صرف چھوٹے بیج ہی چھنتے تھے۔ ایک دن وہ آیا کہ بڑے بیجوں والی گھاس چھوٹے بیجوں والی نئی قسم کی گھاس میں تبدیل ہوگئی اور اُس علاقہ میں بڑے بیجوں والی گھاس کا نام و نشان نہ رہا۔

چند دلچسپ باتیں

ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ پالتو جانوروں کی تمام نسلیں جنگلی جانوروں سے نکلی ہیں۔ گو پالتو جانوروں کو انسانی صُحبت میں رہتے ہوئے لمبا عرصہ ہوگیا ہے اور یہ اپنے جنگلی آباؤاجداد سے شکل و صُورت میں بھی بالکل بدل گئے ہیں لیکن پھر بھی ان میں چند ایسی عادات پائی جاتی ہیں جو اس بات کی یادگار ہیں کہ کبھی اُن کے بزرگ جنگلوں میں رہتے تھے۔ حالانکہ ان عادتوں کی موجودہ حالت میں بالکل ضرورت نہیں ہے۔ یہ وہ عادتیں ہیں جنہیں انسان بھی صدیوں سے انتخاب کرنے کے باوجود ابھی تک اُن سے نہیں چھڑا سکا۔

مثال کے طور پر کتے کو لیں۔ کتے کا پیٹ خواہ بالکل بھرا ہوا ہی کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی وہ شکار کے لئے تیار نظر آئے گا۔ آپ اپنے پالتو کتے کو لے کر سیر کے لئے نکلیں خیال رہے کہ یہ وہ کتا ہے جو آپ کے کبوتروں کو بھی کچھ نہیں کہتا لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کے ساتھ نہیں چلتا کبھی اس جھاڑی میں تو کبھی اُس پیڑ کی جڑیں سونگھتا پھرتا ہے۔ اور اگر اُسے کوئی جانور نظر آجاتا ہے تو وہ اُس کا پیچھا کرتا ہے۔ ممکن ہو سکا تو مار بھی گراتا ہے۔ اس کے برعکس ایک بھیڑ یا گائے کا بچہ ایسا کبھی نہیں کرتا۔ کتا جنگلی بھیڑیئے سے نکلا ہے۔ اس کے آباؤاجداد خرگوش۔ پرندے۔ بھیڑ۔ بکری اور دوسرے جانوروں کو مار کر گذارہ کرتے تھے۔ مگر آج کتا انسانی بستیوں میں رہتا اور برتن میں سے کھاتا ہے

اُسے جنگلی کتوں کی طرح شکار ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اُس کے خون میں ابھی تک خونخوارانہ اثر باقی ہے۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کتا بیٹھنے یا لیٹنے سے پہلے اپنے گرد کئی بار گھوم جاتا ہے۔ کُتّے کی یہ حرکت اُس زمانہ کی یاد دلاتی ہے جبکہ جنگل میں اُس کے آبا و اجداد لمبی لمبی گھاس کو گھوم کر روندتے تھے۔ اور اس طرح اپنے بیٹھنے کے لئے نرم بستر بنا لیتے تھے۔ مگر ایک پالتو کُتّے کے لیے جو نرم گدوں پر آرام کرتا ہو یہ حرکت ایک فضول سی چیز رہ گئی ہے۔

کتے عام طور بھونکتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایک عجیب بھیانک اور خوفناک آواز نکالتے ہیں جسے عُرف عام میں کہتے ہیں کہ کُتا رو رہا ہے۔ وہمی لوگ کتے کے رونے سے خیال کرتے ہیں کہ یہ کسی کی موت کا پیغام ہے۔ کتے کا بھونکنا تو مصنوعی انتخاب کی پیداوار ہے۔ جنگلی کتے جو بھیڑیوں کی ایک قسم ہیں صرف روتے ہیں۔ بھونکتے نہیں جنگل میں بھیڑیا کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ کر اونچی آواز سے چیخنے لگتا ہے۔ اس کا جواب میلوں دُور سے دوسرا بھیڑیا دیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیتے ہیں کبھی کبھی کُتّا بھی اپنے آبا و اجداد کی اس عادت سے متاثر ہو کر رونے لگتا ہے۔

گائے بیل بھینس جیسے گھاس چرنے والے مویشی جُگالی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جانوروں کے باپ دادا گھنے جنگلوں کے رہنے والے تھے۔ وہ میدانی علاقہ میں اپنے دشمنوں سے مورچہ لینا نہیں جانتے تھے لیکن ہری اور نرم گھاس کے لئے اُنھیں میدان میں آنا ہی پڑتا تھا۔ وہ خاموشی سے گھاس چرنے میدانوں میں آنکلتے تھے۔ شیر یا چیتے کے خوف سے جلد جلد جب تک موقع ہوتا تھا گھاس چرتے رہتے اور خطرے پر فوراً جنگلوں

میں غائب ہو جاتے۔ وہاں جا کر اُس گھاس کو دوبارہ معدہ سے مُنہ میں لاکر آرام سے چباتے رہتے تھے۔ کیونکہ میدان میں تو اتنا موقع ہی نہ تھا کہ وہ گھاس کو خوب چبا کر نگل سکتے چنانچہ اس کام کے لئے اُن کے معدے بھی اُسی طرح بدل گئے ہیں۔ مویشیوں کی جُگالی کی عادت شہروں اور بستیوں کی پُرامن فضا میں جہاں کسی درندے کے حملے کا خوف نہیں ایک بے کار سی چیز ہے۔

بھیڑ اور بکری دونوں پہاڑی جانور ہیں۔ ان کے آبا و اجداد اُونچے اونچے ٹیلوں اور پہاڑوں پر رہتے تھے۔ مگر پالتو بھیڑ اور بکری زیادہ تر میدانی علاقہ میں ہی پائی جاتی ہیں۔ اگر کسی بکری کی حرکات کا مطالعہ کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بہت سی ایسی باتیں کرتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ایسے جانوروں کی اولاد ہے کہ جو پہاڑوں پر رہتے ہوں۔ بکری بڑے شوق سے ہر اُونچی جگہ پر چڑھ جاتی ہے۔ آپ نے اسے مکانوں کی چھتوں اینٹ مٹی کے اُونچے ڈھیروں پر اکثر چڑھتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اس کی یہ عادت اس کے باپ دادا کی یاد دلاتی ہے جو پہاڑوں پر چارہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ہر پالتو جانور میں اپنے جنگلی بزرگوں کا کچھ نہ کچھ اثر موجود ہے ہم طوالت کے خوف سے اتنی ہی مثالیں دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

قدرتی انتخاب

پالتو جانوروں اور باغیچی پودوں کے علاوہ بھی تو جنگلوں میں ہزاروں قسم کے جانور اور درخت ہیں جن پر مصنوعی انتخاب کا اثر کبھی نہیں ہوا۔ پھر بھی جنگلی جانوروں میں ہر ایک جانور کی مختلف قسمیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ پُرانے

زمانہ کے جانوروں کے فاسلز جو چٹانوں میں ملتے ہیں اُن سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی ہر ایک جانور کی بہت سی قسمیں تھیں۔ اُس وقت چونکہ انسان کا وجود تک بھی نہ تھا اس لئے مصنوعی انتخاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ جنگلی جانوروں اور پودوں میں پھر یہ مختلف قسمیں کیسے پیدا ہو گئیں؟

یہ سب جانتے ہیں کہ انسان حیوان۔ اور نباتات ان سب میں یہ بات ہے کہ ایک ماں باپ کے بچے بھی بالکل ایک جیسے نہیں ہوتے۔ خاندانی مشابہت کے باوجود اُن میں کوئی نہ کوئی فرق ضرور ہوتا ہے جس سے ہر بچہ الگ الگ پہچانا جاسکتا ہے۔ مثلاً کُتیا کے تمام پلے بالکل ایک جیسے نہیں ہوتے۔ آپس میں کبھی رنگ کا اور کبھی قد کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی پلا چُست اور کھلاڑی ہے تو کوئی زیادہ سمجھدار ہے۔ اور پاؤں سے سلام کرنا جلد سیکھ جاتا ہے۔ وغیرہ۔

اسی طرح ایک ہی قسم کے پودے بھی آپس میں نہیں ملتے۔ کسی کی شاخیں لمبی ہیں تو کسی کا تنا موٹا ہے۔ حتیٰ کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک ہی پیڑ کے سب پتے بھی آپس میں نہیں ملتے۔ ہر پتہ میں اپنی ہی کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔

اب ہم بتاتے ہیں کہ کس طرح قدرت جانداروں میں سے نئی نئی قسمیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ بالفرض ہرن جیسے جانوروں کا ایک غول جنگل کے ایسے حصہ میں رہتا ہے جہاں پر کثرت سے چارہ موجود ہے۔ اُس جنگل میں کوئی شیر بھی اُن کا شکار کرنے یا ستانے کے لئے نہیں ہے۔ ایسی حالت میں یہ جانور آزادی اور بے فکری کے باعث خوب موٹے اور سُست ہو جائیں گے

اُن کی دُشمن کو سونگھ لینے کی قوت بھی کمزور ہوتی جائے گی۔ کیونکہ وہ محفوظ جگہ رہتے ہیں اس لئے اُن کے بچے بھی پُشت در پُشت خوب بڑھتے اور پلتے چلے جائیں گے۔ اب اگر کوئی شیر شکار کی تلاش میں اُس جنگل میں پہنچ جائے اور اتنے زیادہ موٹے تازے اور نرم شکار کو دیکھ لے تو اس جنگل کا سماں ہی بدل جائے گا۔ سب سے موٹے اور سُست ہرن تیز نہ بھاگ سکنے کے باعث سب سے پہلے شیر کا شکار ہوں گے۔ اسی طرح جن ہرنوں کے سونگھنے کی قوت کمزور ہو گئی ہو گی اُن پر بھی شیر اچانک حملہ کرکے مار گرائے گا۔ اس کے برعکس اُن جانوروں کو جن کی لمبی ٹانگیں اور قوتِ شامہ تیز ہو گی بچ جانے کا زیادہ موقع ہو گا۔ کیونکہ وہ بہت دُور سے ہی شیر کی بُو کو سونگھ لیں گے اور ایکدم چوکڑیاں بھر کر جنگلوں میں غائب ہو جائیں گے۔ وہ شیر کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں گے۔ اور اُن کے بچے بھی اُنھیں کی طرح چُست و چالاک ہوں گے۔ اُن ہرنوں پر حملوں کے بار بار ہوتے رہنے سے رفتہ رفتہ تمام سُست اور بیوقوف ہرنوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ صرف چالاک اور تیز ہرن ہی باقی بچیں گے۔ چنانچہ ہرنوں کا وہ غول جس میں سُست موٹے جانوروں کی تعداد زیادہ تھی اب صرف چست و چالاک ہرنوں کا ہی غول رہ جائے گا۔ اس نئے غول کے بچے بھی اپنے ماں باپ کی طرح تیز اور چالاک ہوں گے۔ ان میں سے بھی وہ بچے جو تیز رفتار اور ہوشیار نہ ہوں گے سب سے پہلے پکڑے اور مارے جائیں گے۔ اس طریقہ سے یہ جانور رفتہ رفتہ بدلتے رہیں گے حتیٰ کہ موجودہ زمانہ کے ہرنوں کی مانند ہو جائیں گے جن کی لمبی پتلی ٹانگیں تیز دوڑنے میں خوب مدد دیتی ہیں اور قوتِ شامہ اتنی تیز کہ دُور سے ہی خطرہ کو محسوس کر لیتے ہیں۔ یہاں پر شیر نے ویسا ہی کیا جیسا کہ انسان نے کبوتروں کے

انتخاب میں کیا ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ انسان اپنی پسند کے مطابق کبوتر چُنتا رہا اور باقی کو کھاتا گیا جبکہ شیر نے اُنھیں ہرنوں کو کھایا جو اس کے قبضہ میں آسکے اور باقی کو اُسے مجبوراً چھوڑنا پڑا۔

صرف تیز رفتاری اور قوت شامہ (سونگھنے کی قوت) کے طاقتور ہونے سے ہی جنگل کے جانوروں میں تبدیلی نہیں آتی بلکہ اور بھی کئی وجوہات ہیں جن سے وہ بدلتے جاتے ہیں۔ کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آج کل سپاہیوں کی وردی ہمیشہ خاکی ہی کیوں ہوتی ہے جبکہ پہلے زمانے میں سپاہی رنگ برنگ کے کپڑے پہنا کرتے تھے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں تلواروں سے لڑائی ہوتی تھی۔ اس لئے اُنھیں چھپنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ لیکن آج کل ایک ہوشیار نشانہ باز میل بھر سے بھی زیادہ فاصلہ سے دشمن کو مار سکتا ہے۔ اگر اُسکو وہ نظر آجائے۔ اب اگر کہیں دشمن سُرخ کپڑے پہنے ہوئے ہو تو وہ نشانہ باز بڑی آسانی سے اُسے اپنی بندوق کا نشانہ بنالے گا کیونکہ زمین کے رنگ کے مقابلہ میں سُرخ رنگ دُور سے ہی چمک جاتا ہے مگر خاکی وردی والا سپاہی آسانی سے نظر نہیں آتا۔ اس لئے سپاہی خود کو چھپانے کے لئے خاکی کپڑے پہنتے ہیں۔ جس سے اُن کے کپڑے زمین کے رنگ سے مل جائیں اور دشمن کو معلوم نہ ہو سکے کہ فوج کہاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگی جہازوں پر گہرے رنگ کا وارنش کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے اُن کا رنگ سمندر کے رنگ سے مل جاتا ہے۔ جس سے یہ جہاز دشمن کی نظر اور اُس کی توپوں کی مار سے بچے رہتے ہیں۔ جنگی ہوائی جہازوں کو گہرا نیلا رنگ دیا جاتا ہے تاکہ وہ آسمان میں بادلوں کے رنگ سے مل کر دشمن کی نظروں سے غائب ہو جائیں۔ اور طیارہ شکن توپوں کی زد سے محفوظ رہیں جنگلی جانور بھی اسی طرح

اپنی کھال کے رنگ کے باعث دُشمن کے حملوں سے بچے رہتے ہیں۔ ہرنوں کی مثال میں یہ خیال کرلیں کہ اُس غول میں مختلف رنگ کے ہرن تھے۔ یعنی کچھ سفید کچھ کالے اور بعض خاکی رنگ کے تھے۔ ایسی حالت میں شیر دُور سے ہی سفید اور کالے ہرنوں کو دیکھ لے گا۔ اور اُن پر ہی سب سے پہلے حملہ کرے گا۔ لیکن وہ ہرن جن کا رنگ خاکی ہے آسانی سے نظر نہ آسکیں گے۔ اس لئے دوسروں کی نسبت شیر کے حملے سے بچے رہیں گے۔ ایک وقت وہ آئے گا کہ شیر سب سفید اور سیاہ رنگ کے ہرنوں کو کھا جائے گا۔ صرف خاکی رنگ کے ہرن ہی بچے رہیں گے یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں بھورے رنگ کے ہرن ہی باقی رہ گئے ہیں

نباتات پر گذارہ کرنے والے ننھے ننھے کیڑوں کا رنگ بھی عام طور پر اسی لئے پتوں کے رنگ جیسا ہوتا ہے۔ جس سے وہ چڑیاں جو اُن کی تلاش میں پھرتی ہیں ہرے پتوں میں ہرے رنگ کے کیڑوں کو نہ دیکھ سکیں۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے دُشمنوں سے اُن کی حفاظت ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جانور رفتہ رفتہ آس پاس کی چیزوں کے مطابق بن جاتے ہیں۔ جاڑوں میں اور سرد ممالک میں جہاں کثرت سے برف گرتی ہے پرندے اور جانور برف کی طرح سفید ہوجاتے ہیں۔ گرم دیسوں میں جہاں ہریالی اور درختوں کی بھرمار ہوتی ہے وہ ہرے یا کسی دوسرے چمکدار رنگ کے ہی نظر آتے ہیں۔ غرض کہ جانوروں میں سے وہ ہی زندہ رہتے ہیں جو خود کو اُسی طرح کا بنا لیتے ہیں جیسی کہ آس پاس کی چیزیں ہوں۔ دُشمنوں کے حملوں سے زیادہ تر وہی جانور محفوظ رہتے ہیں جن کا رنگ آس پاس کی چیزوں سے مل جائے جس سے وہ آسانی سے نظر نہ آسکیں۔ اسی طرح سرد ملکوں میں جن جانوروں کی کھال پر گھنے بال پیدا ہوں گے اور جن کا رنگ سفید ہوگا وہی عام طور پر زندہ رہ سکیں گے۔

جو جانور گرد و پیش کے حالات کے مطابق ہو جاتے ہیں، اُن کا زندہ رہنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اُن کی تعداد بڑھنے لگتی ہے دوسروں کی نہیں۔

ایک چیز اور ہے جو دشمنوں سے لڑنے میں مدد دیتی ہے۔ اس دفعہ ہم جنگلی گھوڑوں کے غول کی مثال لیتے ہیں۔ چیتا گھوڑوں کے غول پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اُن کے غول کے نزدیک کہیں چھپا رہتا ہے۔ اور جب کوئی گھوڑا گھاس چرتے چرتے اِدھر اُدھر چلا جاتا ہے تو اُسے اکیلا پا کر حملہ کر دیتا ہے۔ اگر چیتے کو دیکھ کر گھوڑوں کا غول تتر بتر ہو جائے تو چیتا ایک ایک کرکے، اُن سب کو آسانی سے ختم کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں گھوڑوں کے بچے سب سے زیادہ مارے جائیں گے کیونکہ وہ چھوٹے اور کمزور ہونے کی وجہ سے تیز نہ بھاگ سکیں گے۔ اگر بہت سے چیتے اس غول کا شکار کریں۔ اور گھوڑے اپنے بچوں کو چھوڑ چھوڑ بھاگ جایا کریں تو وہ غول چند ہی دنوں میں کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر یہی جنگلی گھوڑے چیتے کے حملے کے وقت ہمت کرکے اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو وہ حملہ آور درندے کی ہمت کو پست کر دیں گے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ بے ضرر سے بے ضرر جانور بھی اپنے بچوں پر حملہ ہوتے دیکھ کر شیر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مُرغی بھی اپنے بچوں کے بچاؤ کے لئے بلی تک پر جھپٹ پڑتی ہے۔ یہ عقلمند اور دلیر گھوڑے بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اگر وہ سب اکٹھے رہیں تو وہ بچوں کی اور اپنی حفاظت زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ اس لئے جب کبھی جنگلی گھوڑوں پر شیر یا چیتا حملہ آور ہوتا ہے تو گھوڑیاں اور بچے فوراً ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مضبوط اور جوان گھوڑے اُن کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب چیتا نزدیک آتا ہے تو یہ دانتوں کو نکالتے

اور کُھروں کو زمین پر زور زور سے پٹخنے لگتے ہیں۔ اس پر بھی اگر چیتا کسی گھوڑے پر حملہ کردے تو سب گھوڑے اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کوئی اُس کی پیٹھ پر کاٹتا ہے تو کوئی اُس کے پیٹ پر اتنی زور سے لاتیں جماتا ہے کہ چیتے کی پسلیاں تک چکنا چُور ہو جاتی ہیں۔ اس طرح جنگلی گھوڑے اس کہاوت کی زندہ مثال ہیں کہ "میل میں ہی جیت ہے اور پھوٹ میں ہار" وہ گھوڑے جنھوں نے اپنے بچوں کی حفاظت کرنا نہیں سیکھا جلد ہی ختم ہو گئے۔ اس کے برعکس جو جتھا بنا کر دُشمن سے لڑنا سیکھ گئے اپنے بچوں کو بچانے کے لئے جان تک لڑا دینے کو تیار ہو گئے۔ پھلتے اور پھولتے رہے۔ اس طرح وہ گھوڑے جن میں بُزدل دلیر، محبتی اور خود غرض ہر قسم کے جانور شامل تھے آخر کار دلیر اور جانفروش جانوروں میں بدل گئے۔

ایسی سینکڑوں مثالیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت کس طرح ابتدائی جانوروں کی شکل وصُورت۔ عادات واطوار اور رنگ کے انتخاب سے نئی قسمیں پیدا کر دیتی ہے۔ قدرت کے اس چُننے کے ڈھنگ کو قدرتی انتخاب Natural Selection کہتے ہیں۔ اور وہ انتخاب جس میں انسان کا ہاتھ ہوتا ہے مصنوعی انتخاب Artificial Selection کہلاتا ہے

حیوانوں کے مختلف خاندان

اگر آپ کو کبھی چڑیا گھر جانے کا اتفاق ہوا ہو یا جانوروں کی تصویروں کی کتاب دیکھی ہو تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ اُن جانوروں میں جنھیں ہم مختلف ناموں سے پکارتے ہیں اکثر ایک طرح کی خاندانی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً چیتا، شیر، جنگلی بلا، قطبی بلا۔ امریکہ کا چیتا جسے جاگور کہتے ہیں۔ اور گھر کی بلا اور بلی۔ یہ سب

آپس میں بہت زیادہ ملتے ہیں۔ چیتے یا جنگلی بلے کو پنجوں سے اپنا منہ پونچھتے دیکھو تو گھر کی بلی یاد آجاتی ہے۔ چیتے کے بچے بالکل بلی کے بچوں کی طرح حرکتیں کرتے ہیں۔ ان سب جانوروں کے پنجے ایک جیسے ہیں اور بلی ہی کی طرح چلنے میں آہٹ نہیں ہوتی۔ سب کے ایک ہی قسم کے دانت اور مونچھیں ہیں۔ ان سب کی خوراک ایک جیسی ہے۔ یعنی یہ سب گوشت خور ہیں۔ ویسے بھی مثل مشہور ہے کہ "بلی شیر کی خالہ ہے"۔

اب ذرا اُن مختلف قسم کے جانوروں کو دیکھیں جو بندر کی قسم کے ہیں۔ اوّل وہ بندر جنھیں ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔ دوسرے اورنگ۔ گوریلا۔ چمپانزی وغیرہ جن کی دُم نہیں ہوتی۔ کالے منہ کے بندر۔ داڑھی والے بندر۔ سفید بندر۔ لنگور وغیرہ۔ یہ سب بندر ہی کے خاندان کے ہیں۔ اِن میں بعض تو انسان سے بھی بہت ملتے جلتے ہیں۔ آپ نے ایسے انسان بھی دیکھے ہوں گے جنھیں دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ اس شخص کی صورت بندر سے بہت ملتی ہے۔ اور اسی طرح جب ہم بندروں کی حرکتوں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں تو کہہ اُٹھتے ہیں کہ بندر انسان سے کتنے ملتے جلتے ہیں۔

پرندوں کے بھی ایسے ہی مختلف خاندان ہیں۔ سینکڑوں پرندے ایسے ہیں جو آپس میں بہت ملتے ہیں۔ بلبل۔ مینا۔ فاختہ۔ ابابیل۔ ابلقا وغیرہ سب ایک ہی کنبہ کے مختلف افراد ہیں۔ برسوں کی محنت اور مشقت کے بعد انسان اس قابل ہوا ہے کہ وہ ان تمام پرندوں کو الگ الگ خاندانوں میں تقسیم کر سکے جب یہ مسلمہ بات ہے کہ مصنوعی انتخاب سے لقا۔ لوٹن۔ یاہو۔ شیرازی۔ مینا۔ خال وغیرہ مختلف قسم کے کبوتر جنگلی کبوتر سے نکلے ہیں تو یہ بھی ظاہر ہے کہ قدرتی انتخاب کے ذریعہ یہ تمام جنگلی پرندے ایک ہی قسم کے ابتدائی پرندے سے نکلے ہیں۔ اسی

انھوں سے بلی کے خاندان کے تمام مختلف ممبر بھی کسی بہت قدیم بلی کی قسم کے جانور کی اولاد ہیں اور تمام قسم کے بندر کسی ابتدائی بندر جیسی قسم کے جانور سے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس قدرتی انتخاب کے ذریعہ دُنیا کے تمام جاندار خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان۔ آبی ہوں یا ہوائی غرض سب کے سب اپنی اپنی ابتدائی نسلوں سے بہت سی قسموں اور خاندانوں میں پھیل گئے ہیں۔

یہ تبدیلیاں حالات پر منحصر ہیں

اتنا تو ہم آپ کو پہلے بتا چکے ہیں کہ کس طرح مصنوعی انتخاب سے ایک نسل کے جانور یا پودے سے بہت سی نئی قسمیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ گھوڑوں اور ہرنوں والی مثالوں سے آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ کس طرح قدرت جانوروں کے گروہوں میں سے خاص خاص قسم کی نسلیں تیار کرلیتی ہے۔ لیکن ایک نسل کا جنگلی جانور مختلف قسموں میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہمیں آپ کو سمجھانی ہے۔ جانوروں کے مختلف قسموں میں تبدیل ہونے میں حالات کا بہت اثر پڑتا ہے۔ یعنی جانوروں کے گروہوں کو جب نئے یا مختلف قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو وہ اُن حالات کے مطابق خود کو بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ قدرت میں ہر طرح کے حالات موجود ہیں۔ مثلاً قطب شمالی میں ہر وقت برف جمی رہتی ہے خطِ استوا پر ازحد گرمی ہوتی ہے۔ میدان اور وادی میں پہاڑ کی نسبت دوسرے حالات ہیں تو سمندر۔ دریا اور صحرا اپنی اپنی جگہ مختلف اثرات کی دُنیائیں ہیں۔ اگر آپ اس پر تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ مختلف ماحول کے مطابق جانور اور نباتات بھی مختلف ہیں۔ مثلاً ریگستان میں جہاں پانی کی بہت کمی ہے ایسے جانور کا ہی گذارہ ہو سکتا ہے جو کئی دن بغیر پانی کے زندہ رہ سکے

اونٹ ایک ایسا ہی جانور ہے۔ قطب شمالی میں جہاں پر بارہ مہینے برف رہتی ہے ایسا جانور ہی رہ سکتا ہے جس کے جسم میں کافی چربی اور گھنے بال ہوں۔ ایسا ایک جانور قطب شمالی کا سفید ریچھ ہے۔

پودوں میں بھی جہاں بارش کم ہوتی ہے وہاں درختوں کی جڑیں زمین میں خوب گہری ہوتی ہیں تاکہ وہ نیچے سے پانی حاصل کر سکیں اور زندہ رہ سکیں۔ اُن کے پتے بھی موٹے اور نوکیلے ہوتے ہیں جس سے اُن میں سے تری نہ نکل سکے۔ مرطوب علاقوں میں درختوں کی جڑیں کم گہری ہوتی ہیں اور پتے چوڑے ہوتے ہیں جن سے بلا ضرورت پانی نکلتا رہتا ہے۔

دریا اور سمندر کے کنارے ایسے ہی پرندے ملیں گے جو چل کر۔ تیر کر یا غوطہ لگا کر پانی میں سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ یا کنارے پر کیکڑے اور گھونگھے کھاتے ہیں۔

جس طرح انسان تلاشِ روزگار یا دوسری وجوہ سے پردیس چلے جاتے ہیں اسی طرح جانور بھی تعداد کی زیادتی اور خوراک یا چارہ کی کمی سے تبدیل آب وہوا یا دشمن کے ڈر سے دوسرے مقامات کو چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں کی آب وہوا اور خوراک پہلی جگہ کی نسبت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اب اُس غول کے جانور جو اس نئی جگہ کی گرمی یا سردی برداشت نہ کر سکے یا نیا چارہ اُن کے موافق نہ آیا تو ظاہر ہے کہ وہ مر جائیں گے قدرت اُن جانوروں کو ختم کر دے گی جو اس نئے ماحول یا حالات کے مطابق خود کو نہ بدل سکیں گے۔ اور اُن جانوروں کو چن لے گی جو نئے حالات کے مطابق اپنے کو بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس طرح قدرت اُن جانوروں کی نسبت مختلف جانور بنا دے گی جو اس جنگل میں رہتے ہیں جہاں سے یہ غول آیا

تھا۔

اگر کسی مقام سے ایک ہی نسل کے جانوروں کے غول مشرق مغرب شمال جنوب یعنی چاروں طرف جاتے ہیں تو وہ غول جو پُورب کو گیا اُس میں پُورب کی آب وہوا اور حالات کے مطابق تبدیلی آتی جائے گی۔ اور وہ غول جو مغرب کو گیا تھا وہاں کے حالات کے مطابق کسی اور صُورت میں جو مشرق والوں کی نسبت مختلف ہوگی تبدیل ہو جائے گا۔ علی ہذا القیاس۔

آسٹریلیا میں انگریزوں کے جانے سے پہلے خرگوش نہیں تھے جب یہ لوگ یُورپ سے خرگوش وہاں لے گئے تو وہاں کی آب وہوا اور حالات اُن کے موافق آئے۔ کھانے کے لئے کثرت سے گھاس تھا اور اُن کے دشمن درندے بھی وہاں نہ تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ زمین پر اُنھوں نے کوئی بھی ہری چیز نہ چھوڑی۔ کھیتی کو اتنا نقصان پہنچایا کہ لوگوں کو خرگوش کے ختم کرنے کے لئے بیس برس کے عرصہ میں پچیس کروڑ روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ خرگوشوں میں وہاں کے نئے حالات کے باعث ایک نئی بات پیدا ہوگئی یعنی بعض خرگوشوں کے پنجے زیادہ لمبے نکلنے لگے۔ زمین پر رہنے والے خرگوشوں کی تعداد جب زیادہ بڑھ گئی اور گھاس یا چارہ کے ڈھونڈنے میں زیادہ دقت کا سامنا ہوا تو وہ خرگوش جن کے لمبے پنجے تھے بھوک سے مجبور ہو کر درختوں پر چڑھ کر پتے کھانے لگے۔ دُنیا میں اسی طرح نئی نئی قسمیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لمبے پنجوں کے پیدا ہو جانے سے درختوں پر چڑھنے کی آسانی کی صُورت میں قدرتی چُناؤ کا یہ عمل آئندہ بھی ہوتا رہا تو آسٹریلیا کے خرگوش بہت ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ دو قسموں میں بٹ جائیں۔ اوّل زمین پر رہنے والے عام خرگوش۔ دوسرے درختوں پر رہنے والے۔

جس طرح انسان مصنوعی انتخاب کے ذریعہ باغیچی پھلوں پھولوں اور

پالتو جانوروں کی نئی نئی قسمیں پیدا کر لیتا ہے اُسی طرح قدرت اپنے انتخاب کے ذریعہ مختلف قسم کے جنگلی پودے۔ درخت اور جانور پیدا کرتی رہتی ہے۔

پودے بھی جانوروں کی طرح جان رکھتے ہیں۔ اُنھیں بھی ہماری طرح غذا اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بھی ہوا میں سانس لیتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ ان پر بھی حالات کا اثر ہوتا ہے۔ اسلئے ان میں بھی زندگی موجود ہے لیکن پودوں اور حیوانوں کی زندگی میں کچھ فرق بھی ہے۔ یعنی نباتات اپنی غذا مٹی اور ہوا سے حاصل کرتے ہیں۔ حیوان اپنی خوراک نباتات اور حیوانات سے مہیا کرتے ہیں۔ پودے ایک ہی جگہ قائم رہتے ہیں۔ اس کے برعکس حیوان خوراک کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ نباتات میں شعور نہیں ہے اور حیوان باشعور ہوتے ہیں۔ پودے ہرے رنگ کے ہوتے ہیں اور حیوانوں میں اس قسم کا کوئی رنگ نہیں پایا جاتا۔ لیکن نباتات اور حیوانات کا یہ فرق صرف اعلیٰ درجہ کے نباتات اور حیوانات میں ہی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ بعض ایسے ادنیٰ قسم کے حیوان اور جراثیم بھی ہیں جو بالکل ہرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ سبز رنگ پودوں کی خاص خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ بعض پودوں میں حرکت بھی پائی جاتی ہے۔ جیسے لاجونتی کو اگر چھُوا جائے تو اس کے پتے سمٹ کر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

خوردبین کی مدد سے ویلیزنیریا Valesnaria نام کی پانی میں پیدا ہونے والی گھاس کو دیکھا جائے یا ٹراڈیسکانشیا (Tradescantia۔) نامی پودے کے پھول کے اندرونی ریشوں کا ملاحظہ کیا جائے تو جس طرح جانداروں کے جسم میں خون کا دوران ہوتا ہے اُسی طرح ان پودوں کے اندر بھی زندگی پیدا کرنے والے مادّہ کی (Protoplasm)

دھار بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

پودوں کو بھی زندگی کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ زمین میں جڑ کو گہرا لے جانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سورج کی روشنی حاصل کرنے کے لئے۔ شاخوں کو اِدھر اُدھر پھیلانے کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اُن جانوروں سے جو اُنھیں کھانا چاہتے ہیں۔ اُن کیڑوں سے جو اُن کے تنوں اور شاخوں میں اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ اور بہت سی آفتوں سے اُنھیں لڑنا پڑتا ہے۔ کھیتوں میں اُونٹ کٹاری کے پودے اکثر نظر آتے ہیں مویشی انھیں نہیں کھاتے۔ کیونکہ ان کا ذائقہ کھٹا اور جھاڑی خاردار ہوتی ہے۔ پودے بھاگ یا چھپ تو سکتے ہی نہیں۔ اس لئے ان کے بچنے کی دوسری ترکیبیں ہیں۔ ذائقہ کا کھٹا ہونا ایک طریقہ ہے تو کانٹوں کا ہونا دوسرا جھڑبیری خارپشت وغیرہ کانٹے دار پودوں کو جانور کبھی کھانے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کو کھانے سے اُن کے مُنہ میں کانٹے چُبھ جائیں گے

جانوروں کی طرح پودے بھی مختلف آب وہوا اور نئے حالات میں اپنی پہلی صُورت سے بدل جاتے ہیں۔ ہم اس بات کو نہیں بھولے ہیں کہ پودے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکتے۔ وہ جس جگہ پیدا ہوتے ہیں وہیں مر جاتے ہیں۔ لیکن پودوں کے بیج تو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ آک یا مدار کے بیجوں پر روئی جیسا رُواں ہوتا ہے۔ یہ بیج اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ تیز ہوا کے ساتھ اُڑ کر میلوں دُور چلے جاتے ہیں۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی جگہ جا گریں جو اُس زمین سے مختلف ہو جہاں سے وہ اُڑے تھے۔ اسی طرح کُھردار جانوروں یا پرندوں کے پنجوں میں پودوں کے بیج چپک جائیں اور یہ جانور بیجوں کو اپنے ساتھ لے جا کر میلوں دُور کہیں گرا دیں تو وہ کسی نئی زمین پر پہنچ جائیں گے۔

کئی طرح کے بیج دار پھل مثلاً گولر۔ رسبھری۔ بلیک بیری وغیرہ کو پرندے کھا لیتے ہیں۔ اُن کا گودا تو اُن کے پیٹ میں ہضم ہو جاتا ہے لیکن بیج ہضم نہیں ہوتے۔ پرندے میلوں دُور اُڑ کر بیٹ کریں تو وہ بیج بھی اُس فضلہ میں مل کر باہر آجاتے ہیں۔ اور اگر اچھی زمین پر گریں تو بعض اوقات جم کر پیڑ یا پودے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح دریا کنارے کے پیڑوں اور پودوں کے بیج پانی میں بہہ کر سینکڑوں کوس چلے جاتے ہیں۔ سمندر کے کنارے ناریل کے درخت ہوتے ہیں۔ جوار بھاٹا آنے سے پانی کی لہریں اُن کی جڑوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور درختوں کے آس پاس گرے ہوئے ناریلوں کو (جو اصل میں اس پیڑ کے بیج ہیں) اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہیں۔ یہ ناریل سمندر کی لہروں کے ساتھ بہتے ہوئے ہزاروں میل کسی دوسرے ساحل پر پہنچ سکتے ہیں۔ ایسے ہی اور بھی کئی ذرائع ہیں جن سے پودے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ جب حالات میں تبدیلی ہوتی ہے تو پودے بھی جانوروں کی طرح حالات کے مطابق رفتہ رفتہ نئی قسموں میں تبدیل ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

قدرتی انتخاب اور حالات کے مطابق بدلنے (Adaptatoin) کی ایک نہایت دلچسپ مثال ہمیں صحرائی گلاب Rose of Zericho سے ملتی ہے۔ یہ پودا ریتلے اور خشک میدانوں میں ہوتا ہے۔ صحرا یا خشک زمین میں وہی پودے زندہ رہ سکتے ہیں جو گرمی و خشکی کو برداشت کر سکیں۔ اور مہینوں پانی نہ ملنے پر بھی زندہ رہ سکیں۔ گرمیوں میں جب سوکھے دن ہوتے ہیں تو صحرائی گلاب کے بیج پک جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی پت جھڑ بھی ہو جاتی ہے۔ اس کی ننگی شاخیں چاروں طرف سے مُڑ کر بیج کی پھلیوں کو گھیر لیتی ہیں۔ تاکہ بیجوں کی حفاظت ہو سکے۔ پانی نہ ملنے سے جڑ سوکھ کر مٹی ہو جاتی ہے جس

پودا جڑ سے الگ ہو کر گر جاتا ہے۔ یہ سوکھا ہوا پودا ہوا کے ساتھ ساتھ صحرا میں اِدھر اُدھر لڑھکتا پھرتا ہے۔ اب اگر ہوا اسے کسی نمی دار زمین تک پہنچا دے یا پھر موسم برسات ہی شروع ہو جائے تو یہ سوکھا ہوا پودا پھر سے ہرا ہو جاتا ہے اور اپنے بیجوں کو اُس نمی دار جگہ پر پھینک دیتا ہے تاکہ وہ اُگ سکیں۔

قدیم زمانے میں جبکہ زمین زیادہ ٹھنڈی ہوئی تھی تو اسکی سطح پر آب و ہوا اور حالات میں بھی جلد جلد تبدیلیاں ہوا کرتی تھیں کبھی تو سورج کی گرمی اتنی بڑھی کہ ناقابل برداشت ہو گئی اور کبھی ہزاروں برس تک سردی سے زمین کے بہت بڑے حصے پر ہر وقت برف جمی رہی زمین کے بار بار ابھرنے و دھنسنے سے خشکی کی جگہ سمندر اور سمندر کی جگہ خشکی ہو جاتی تھی جس سے موسم اور حالات میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کے مطابق جانوروں و نباتات میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں۔ نئی نئی قسمیں پیدا ہوتی رہیں۔ اور بہت سی قسمیں حالات کے غیر موزوں ہونے کے باعث صفحۂ ہستی سے ختم بھی ہو گئیں۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے تمام جانور اور پودے پہلے زمانہ کے پودوں اور جانوروں کی نسلوں سے نکلے ہیں۔ اور یہ تمام قسمیں قدرتی انتخاب کے ذریعہ ہی پیدا ہوئی ہیں۔

جب کوئی جانور یا پودا نئے حالات کے مطابق بدل جاتا ہے تو بعد میں وہ اپنی بدلی ہوئی صورت کے مطابق ہی رہتا ہے۔ بشرطیکہ نئے حالات اُسے بدلنے پر مجبور نہ کریں۔ جہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں Starfish سٹارفش (ایک قسم کی مچھلی) ہمیشہ سٹارفش ہی رہے گی۔ لیکن حالات اور ضرورت عجیب و غریب تبدیلیاں پیدا کر دیتی ہیں۔ آب و ہوا اور سطح زمین کی لاتعداد تبدیلیوں کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ جس کی وجہ سے مختلف قسم کے جاندار پیدا ہوتے گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے تمام جانوروں اور پودوں کے

وہ آباواجداد (بزرگ) جو پہلے زمانے میں تھے کہاں سے آئے ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کے تمام جانور اور نباتات بہت سے مختلف خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ آپ کو یہ جانکر تعجب ہوگا کہ جانوروں کی یہ تمام قسمیں اور خاندان جنھیں ہم آج دیکھ رہے ہیں ابتدائی زمانہ کے جانوروں کے ایک ہی خاندان سے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح تمام قسم کے پودے اور درخت بھی شروع زمانہ کے نباتات کے ایک دوسرے خاندان سے نکلے ہیں مطلب یہ کہ تمام چرندے۔ درندے پرندے، کیڑے مکوڑے وغیرہ سب جانور ایک ہی حیوانی خاندان سے اور پھل پھول اور درخت وغیرہ سب قسم کے پودے نباتات کے دوسرے ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ آلو کا چھوٹا سا پودا اور برگد (بڑ) کا اتنا عظیم الشان درخت ایک ہی خاندان سے کیسے نکل سکتے ہیں ؟ ایک ننھے سے کیڑے اور پہاڑ سے ہاتھی کا آپس میں کیا رشتہ ہو سکتا ہے ؟ گو شیر اور بلی میں یا سیب اور ناشپاتی میں خاندانی مشابہت اور رشتہ ضرور ہے۔ لیکن آلو اور برگد میں۔ کیڑے اور ہاتھی میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کا آپس میں تعلق ہو اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

مگر کہاوت ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بڑی چیز بن جاتی ہے۔ یعنی تھوڑے تھوڑے فرق سے بہت بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے کسی جانور کی سو پُشت کا خیال کریں۔ ہر پشت کی اولاد حالات کی تبدیلی کے باعث اپنے ماں باپ سے کم وبیش بدلتی جاتی ہے۔

جب سو پشتیں گذر جائیں گی اور ہر پشت میں سب سے پہلی پُشت کی نسبت تھوڑا تھوڑا فرق بڑھتا جائے گا تو یہ سو پشتوں کے چھوٹے چھوٹے فرق ایک بہت بڑا فرق پیدا کر دیں گے۔ اسی طرح ہزار پشتیں گذر جائیں

تو پہلی پیڑھی کی نسبت بہت زیادہ فرق ہو جائے گا۔ اور اگر ایک لاکھ پشتوں کا خیال کریں تو پہلی پیڑھی اور آخری پیڑھی میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ یہ تبدیلیاں لاکھوں برس میں ہی ہوتی ہیں۔ اتنے لمبے عرصہ کے مقابلہ میں انسان کا عرصۂ حیات کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا اس لئے سرسری طور پر سوچنے سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ انسان کو اپنی زندگی میں کسی جانور یا پودے میں تبدیلی ہوتی محسوس نہیں ہوتی۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو دریا، سمندر، پہاڑ وغیرہ بھی جنھیں ہم عام طور پر قائم سمجھتے ہیں بالکل قائم نہیں ہیں۔ اِن میں بھی ہر وقت کچھ نہ کچھ تبدیلی ظاہر ہوتی رہتی ہے یہی حال جانداروں کا بھی ہے۔ انہی طرح طرح کی قسمیں اور کنبے ظاہرا بالکل ویسے کے ویسے ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن میں حالات کے بموجب برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو لمبی ہزار برس کے بعد نمایاں طور پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ قدرت نے جانداروں میں ایسی عجیب و غریب تبدیلیاں کی ہیں کہ تمام قسم کے جانور ایک خاندان سے اور تمام قسم کے پودے دوسرے خاندان سے پیدا ہوگئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں دُنیا کے تمام جانور ایک ہی قسم کے ابتدائی جانور سے اور تمام پودے ایک ہی قسم کے ابتدائی پودے سے نکلے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے میں اس چیز سے بھی مدد ملے گی کہ قدرت کے پاس جانوروں اور پودوں کے خاندانوں میں مختلف قسمیں اور نسلیں پیدا کرنے کے لئے بہت کافی وقت تھا۔ قدرتی انتخاب کا اثر قدیم زمانہ کے جانوروں اور پودوں پر بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ موجودہ زمانے کے حیوانات اور نباتات پر ہے۔ موجودہ زمانہ کے جانوروں اور پودوں کی بے شمار قسمیں اُن قدیم جانوروں اور پودوں کی اولاد ہیں جن کے فاسلز چٹانوں میں ملتے ہیں۔ فاسلز کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ابتدائی جانور اور پودے درجہ بدرجہ موجودہ زمانہ کے جانوروں اور پودوں میں تبدیل

ہو گئے۔ ان سے ہمیں تمام جانداروں کا شجرۂ نسب معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ پتہ لگا لینے پر کہ ان چٹانی کتابوں کو جن میں فاسلز ملتے ہیں بنے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے۔ ہم بتا سکتے ہیں کہ قدرت کو جانداروں کا خاندان پیدا کرنے میں کتنا وقت صرف کرنا پڑا۔

فاسلز کی قدامت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دُنیا کو پیدا ہوئے صرف چھ ہزار برس ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم اُوپر ذکر کر آئے ہیں سائنسدانوں کی محنت اور کوشش سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زمین کو سُورج سے علیحدہ ہوئے کم از کم دو ارب برس ہو چکے ہیں۔ اور اُس وقت زمین از حد گرم تھی۔ ضروری ہے کہ اس واقعہ کے بعد کچھ عرصہ گذر جائے۔ یہاں تک کہ زمین اتنی ٹھنڈی ہو کہ اُس پر کوئی زندہ رہ سکے۔ اگر ایک اَرب ۱۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ برس زمین کے ٹھنڈا ہونے میں صرف ہوئے ہوں تو بھی ایک اَرب برس باقی بچتے ہیں۔ یہ عرصہ اتنا لمبا ہے کہ انسان اس کا بخوبی احساس بھی نہیں کر سکتا۔ صرف دس لاکھ برس کے لمبے عرصہ کا خیال کرنے سے ہی دماغ چکرانے لگتا ہے۔ جن عالموں نے چٹانوں کا مطالعہ کیا ہے وہ بتاتے ہیں کہ چٹانیں تقریباً ایک اَرب ساٹھ کروڑ برس کے ریکارڈ کا پتہ دیتی ہیں۔ جانداروں کی موجودگی کے سب سے قدیمی نشانات یا فاسلز کی عمر تقریباً اَسی کروڑ برس ہے۔ گو یہ سب ماہرانِ علم الارض کا اندازہ ہی ہے۔ لیکن یہ بات تو یقینی ہے ہی کہ فاسلز کروڑوں برس پُرانے ہیں۔ چنانچہ قدرت کے پاس جانداروں کے خاندان کو مختلف قسموں اور نسلوں میں پھیلانے کے لئے کروڑوں برس کا عرصہ تھا۔ اس طویل عرصہ

ہیں زمین کی سطح اور نقشہ بھی بار بار بدلتا رہا ہے۔ زمین کا کہیں سے اُبھرنا اور کہیں بیٹھنا حالات اور ماحول میں تبدیلی لاتا رہا ہے۔ جیسے جیسے حالات میں تبدیلی ہوتی رہی ویسے ویسے جانوروں اور پودوں کی شکل و شباہت۔ اور عادات و اطوار میں بھی فرق پڑتا گیا۔

کیا پودے بھی جانور بن سکتے ہیں؟

پیشتر اس کے کہ اس باب کو ختم کیا جائے ہم ایک اور دلچسپ بات آپ کو بتانا چاہتے ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ پودے اور جانور میں کیا فرق ہے؟ آپ کہیں گے کہ اس کا جواب تو نہایت آسان ہے۔ پودا زمین میں سے اُگتا ہے اور اُسی جگہ جما رہتا ہے۔ اس کے برعکس جانور ایک جگہ سے دوسری جگہ آجا سکتا ہے۔ مگر یہ کسی حد تک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بعض پودے بھی ایسے ہیں کہ جو پانی میں اِدھر اُدھر تیرتے رہتے ہیں۔ اور بعض ایسے جانور بھی ہیں جو چلتے پھرتے نہیں۔ بلکہ ایک جگہ قائم ہیں۔ مثلاً مونگا جو ایک قسم کا جانور ہے لیکن ایک ہی جگہ قائم ہے۔ یہ وہی مونگا ہے جس کی مالا بھگت لوگ گردن میں ڈالتے ہیں۔ اور حکیم اس کا کشتہ بنایا کرتے ہیں۔ اسپنج بھی اسی قسم کا ایک جانور ہے۔ اصل میں یہ بتانا کہ جانور اور پودے میں کیا فرق ہے نہایت مشکل ہے۔ بیسیوں عالموں نے اس مسئلہ پر برسوں دماغ سوزی کی ہے۔ اور اس بات کا مطالعہ کرنے کے دَوران میں کہ پودے اور جانور کس طرح زندہ رہتے ہیں انھوں نے ایسے جانداروں کا بھی پتہ لگایا ہے جن کا زندہ رہنے کا طریقہ آدھا پودوں کی طرح اور آدھا جانوروں کی طرح ہے۔ اس لئے اُن چھوٹے چھوٹے جانوروں کا نام نباتاتی جانور

ہیں جو اتنے ننھے اور چھوٹے ہیں کہ اُنھیں صرف خوردبین سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان جانداروں کو نہ تو جانور کہا جاسکتا ہے اور نہ پودا۔ محض لعاب دار مادہ کے چھوٹے چھوٹے نقطے ہیں جو زندہ نظر آتے ہیں۔

Plant animal رکھا گیا ہے۔ ایسے ہی اور بھی جاندار

جب بعض جاندار ایسے بھی ہیں جن میں جانور اور پودے کی پہچان نہیں ہوسکتی اور بعض ایسے ہیں جو نہ جانور ہیں اور نہ پودے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ تمام جانور اور پودے ایک ہی جاندار سے پیدا ہوئے ہوں؟ مطلب یہ کہ جانور اور پودے دونوں ایک ہی بڑے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں تمام جاندار ایک بڑے خاندان سے نکلے ہیں۔ اور ایک ہی باپ دادا کی اولاد ہیں!



انسانوں کا باوا آدم کون تھا؟

اس سوال کو اس وقت رکھنا جب کہ ہم جانداروں کے سب سے پہلے آبا و اجداد کے بارے میں ذکر کر رہے تھے کچھ بے محل سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ قدرتی کتابوں یعنی فاسلز کی ترتیب میں بھی انسان کا ذکر سب سے آخری صفحوں پر ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ "چلنا تو سڑک کا چاہے پھیر کیوں نہ ہو" گو یہ کہاوت ہر موقعہ پر ٹھیک نہ اُترتی ہو مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ انسان جنگل سے گھر جلدی پہنچنے کے لئے پگڈنڈیوں پر چلنے سے راستہ بھول جاتا ہے۔ اور پھر خیال آتا ہے کہ اس سے بہتر

تو یہ تھا کہ میں سڑک سڑک چلا جاتا۔ کم از کم راستہ تو نہ بھولتا۔ چاہے دیر میں ہی گھر پہنچتا۔ ایسے ہی ہم اس سوال کو حل کرنے سے پیشتر کہ ابتدا میں کس قسم کے جاندار تھے۔ سب سے پہلے انسان کے متعلق سمجھ لیں تو بہتر ہو گا۔ چنانچہ اس سوال کا جواب کہ پہلا انسان کون تھا۔ مختلف خیال کے لوگوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے دیا ہے۔ انجیل کا قول ہے کہ خدا نے آدمی کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ انجیل کے ایک دوسرے حصہ میں بھی بات ایک اور پیرائے میں درج ہے۔ یعنی خدا نے آدمی کو خاک سے بنایا اور اُس کے نتھنوں میں زندگی کی رُوح پھونک دی۔ اسی حصہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عورت کیسے بنی خدا نے آدم کو گہری نیند سُلا دیا۔ پھر اُس کی ایک پسلی نکال لی اور پسلی کی جگہ گوشت بھر دیا۔ اُس پسلی سے خدا نے عورت بنا دی۔ ایسا ہی خیال قرآن کا بھی ہے۔ لیکن وہ وحشی قومیں جنھوں نے انجیل یا قرآن کو کبھی نہیں پڑھا انسان کی ابتدا کے بارے میں اور ہی قصہ سُناتی ہیں۔ نیوزی لینڈ کے موری کہتے ہیں کہ اُن کے دیوتا ٹیکی نے تھوڑا سا سُرخ مٹی کا کیچڑ لے کر اُس میں اپنا خون ملایا۔ پھر اُس سے انسان جیسا ایک پُتلا بنایا اور اُس میں زندگی کی ہوا بھر دی بحر جنوبی میں جزیرہ ٹاہی ٹی کے باشندے کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کو سُرخ مٹی سے بنایا اور ایک دن اُس کو گہری نیند سُلا دیا۔ سوتے میں خدا نے انسان کے جسم کی ایک ہڈی نکال لی۔ اور اس ہڈی سے عورت بنا دی یہ قصے بھی انجیل اور قرآن کی کہانیوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ بعض وحشی قوموں میں اس کے متعلق دوسرے قصے مشہور ہیں۔ بحر جنوبی میں جزیرہ موٹا کے باشندوں میں روایت ہے کہ قاٹ نے (جو بڑا بہادر تھا) انسان کو دریا کنارے کی مٹی سے بنایا۔ انسان کے ساتھ سُوّر کو بھی دوپایہ بنایا۔ لیکن قاٹ کے بھائی

ناراض ہونے لگے کہ سُور کو انسان جیسا کیوں بنایا۔ تب قاٹ نے سُور کو دھکا دیا۔ جس سے وہ آگے گر کر چوپایہ ہو گیا۔

مندرجہ بالا قصّوں سے بورنیو کے جنگلی باشندوں کا قصّہ زیادہ دلچسپ ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ دو بڑے پرندوں نے انسان کو بنانے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے اُنھوں نے درخت بنائے۔ لیکن درختوں میں سے انسان کو نہ بنا سکے۔ تب انھوں نے انسان کو چٹانوں سے بنانے کی کوشش کی جب وہ چٹان سے آدمی بنا چکے تو وہ صرف بے جان بُت ہی بن سکے آخر اُنھوں نے تھوڑی سی مٹّی لی۔ اور اُسے پانی میں ملا کر گوندھا۔ اس مٹّی سے انسان کو بنایا جو زندہ تھا۔

آسٹریلیا کے قدیم باشندے کہا کرتے ہیں کہ ہنڈجیل نے انسان کا جوڑا کیچڑ سے بنایا۔ پہلے اُس نے اپنے چاقو سے درخت کی چھال کے دو چوڑے ٹکڑے کاٹے۔ پھر کیچڑ لے کر ایک تختے پر پھیلا دی اور اس کا آدمی بنایا۔ اسی طریقے سے اُس نے ایک عورت بنائی۔ وہ اپنے کام سے اتنا خوش ہوا کہ ان پُتلوں کے گرد ناچنے لگا۔ اس کے بعد اُس نے درخت سے کچھ ریشہ دار چھال کاٹی۔ اُس چھال میں سے ریشے نکال کر اُن پُتلوں کے سروں میں بالوں کی جگہ لگا دیئے۔ ہنڈجیل اپنی کاریگری سے اور بھی خوش ہوا۔ پُتلوں کو زندہ کرنے کے لئے وہ اُن پر لیٹ گیا۔ اور اُن کے مُنہ اور ناک میں زور زور سے پھونکیں مارنے لگا۔ جب وہ زندہ ہو گئے تو خوش ہو کر ایک دفعہ پھر اُن کے گرد ناچنے لگا۔

آریوں کا خیال ہے کہ شروع میں جوان مرد اور جوان عورتیں زمین میں سے باہر نکل آئیں۔ سناتنی کہتے ہیں کہ سب سے پہلے انسان برہما کے مُنہ

ہاتھ پیٹ اور پیروں سے نکلے تھے۔ اسی بنا پر انسان کو وہ چار ذاتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

جزیرہ پیلیو کے باشندوں میں روایت ہے کہ سب سے پہلے آدمی ایسی مٹی سے بنائے گئے تھے جس میں کئی جانوروں کا خون شامل کیا گیا تھا۔ اس لئے سب سے پہلے آدمی اُن جانوروں ہی کی طرح تھے۔ کہ جن جن کا خون اُس مٹی میں شامل کیا گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ بعض آدمی شیر کی طرح تُند۔ بعض بھیڑ کے بچے کی طرح حلیم اور بعض لومڑی کی طرح مکار ہوتے ہیں۔

وحشی قوموں کا یقین ہے کہ جانور اُن کے رشتہ دار ہیں۔ جزیرہ ساموا کے باشندے کہتے ہیں کہ وہ مگرمچھ کی اولاد ہیں۔ شاید ساموا کے باشندوں کا یہ خیال اس سے پیدا ہوا ہو کہ وہ بہت اچھے تیراک اور زبردست لڑنے والے ہیں

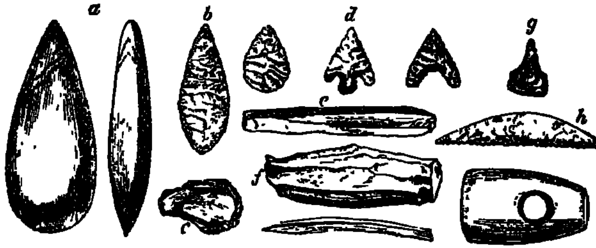
ہمارے خیال میں انسان کی پیدائش کی یہ تمام روایتیں من گھڑت اور بچوں کی سی کہانیاں ہیں لیکن ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ وحشی بہت سی باتوں میں بچوں ہی کی طرح ہیں۔ اس کے علاوہ چٹانوں کے نشانات مصنوعی اور قدرتی انتخاب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے ایسی عجیب قیاس آرائیاں کیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔



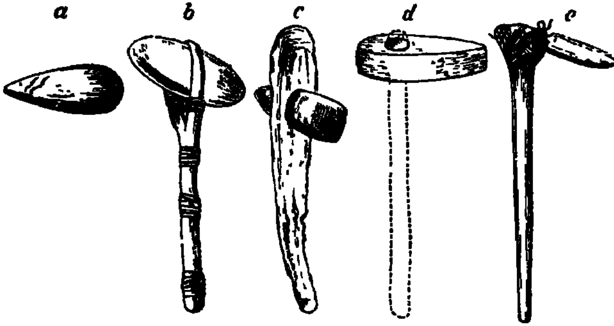
انسان کا شجرۂ نسب

ہمیں سچائی کو جاننے کے لئے انسانی خاندان کے شجرۂ نسب کا نہایت غور سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلی سیڑھی اُن تاریخی کتابوں یا واقعات کے مطالعہ سے طے ہوگی۔ جو ہمیں آج سے سینکڑوں برس پہلے کے مردوں اور عورتوں

No. 1.



No 2



نمبر ۱: پتھر کے ہتھیار اور اوزار جنھیں ہمارے پتھر کے زمانہ کے بزرگوں نے بنایا تھا۔
نمبر ۲: پتھر کے ہتھیار جنھیں موجودہ زمانہ کی بعض وحشی قومیں استعمال کرتی ہیں

صفحہ ۸۵ کے سامنے

کے حالات بتاتی ہیں۔ مگر جب ہم دو تین ہزار برس تک کے حالات کا جائزہ لے چکتے ہیں تو پھر اُس سے پہلے کے حالات جاننے میں ہمیں تاریخ سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تین چار ہزار برس پہلے کے لوگ لکھنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے اُس زمانہ کی یادگاروں اور کھنڈرات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ کیسے تھے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پُرانے زمانے کے انسانوں کے نشانات کہاں تک ملتے ہیں۔ تاریخ دانوں کے پاس اس امر کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ دریائے فرات کی وادی میں مسیح سے ۳۸۰۰ برس پہلے بھی ایک پُرجلال بادشاہ سارگون اوّل حکومت کرتا تھا۔ وادیٔ سندھ اور ہند کے دوسرے حصوں میں کھُدائی کے بعد کھنڈرات نکلے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے ۹۰۰۰ برس بیشتر دڑاوڑ نسل کے انسانوں کا یہاں پر ایک تمدن موجود تھا۔ مصر اور کلدان میں زمین کھودنے سے کھنڈرات نکلے ہیں جو آج سے تقریباً پندرہ ہزار ۱۵۰۰۰ برس پہلے کے لوگوں کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ کافی مہذب تھے۔ اب اگر ہم اس زمانہ سے بھی اَور آگے بڑھنا چاہیں تو یہ کھنڈرات بھی ہماری کچھ مدد نہیں کرتے۔ لیکن اگر ہمیں پُرانے سے پُرانے کھنڈرات سے اَور پہلے کے حالات کا پتہ نہیں ملتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کے تمام نشانات کھو بیٹھے ہیں۔ اور اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کر سکتے جب انسان کی بنائی ہوئی کتابیں اور دیگر چیزیں ہمیں کچھ نہیں بتاتیں تو قدرت کی کتابیں جو چٹانوں کی تہوں میں لکھی ہوئی ہیں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ہم اوپر بھی ذکر کر آئے ہیں کہ انسان کی موجودگی کے نشانات اُن چٹانی کتابوں میں سب سے آخری صفحوں پر ہی ملتے ہیں۔ دریا

کنارے دلدلوں میں یا پُرانی غاروں کی زمین میں دبی ہوئی انسانی ہڈیاں پائی جاتی ہیں ان ہڈیوں سے ہم اُن لوگوں کے متعلق بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں جو کبھی دریاؤں کے کناروں پر یا اُن غاروں میں رہا کرتے تھے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ہمیں اُن اوزاروں اور ہتھیاروں سے مدد ملتی ہے جو وہ اپنے پیچھے غاروں میں چھوڑ گئے تھے۔ ان میں سے جو سب سے پُرانے اوزار اور ہتھیار ہیں وہ چقمق (Flint) پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ اس پتھر میں خاص بات یہ ہے کہ اگر اس کو توڑا جائے تو اس کے لمبے لمبے ٹکڑے ہو جاتے ہیں جن کے کنارے نہایت تیز ہوتے ہیں۔ اُن لوگوں کے پاس نہ تو ہمارے جیسے ہتھیار رہتے تھے۔ اور نہ ہی وہ لوہا وغیرہ دھاتوں کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ اس لئے اُنھیں اپنے دشمنوں سے لڑنے اور شکار کھیلنے کے لئے انہی پتھروں کے ٹکڑوں سے کام لینا پڑتا تھا۔

ہمارے وحشی بزرگ

جہاں کہیں بھی ان قدیم آدمیوں کے فاسلز ملتے ہیں وہاں اُن کے ساتھ ساتھ عام طور پر پتھر کے ہتھیار بھی زمین میں دبے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اب ان پتھر کے اوزاروں اور ہتھیاروں کو عجائب گھروں میں رکھدیا گیا ہے۔ اِن ہتھیاروں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو کھردرے اور دوسرے صاف اور چکنے۔ کھُردرے قسم کے اوزار اور تیروں کے سر تو صرف پتھر کو توڑ کر بنائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن صاف اور چکنے اوزار کھردرے اوزاروں کو پتھر پر رگڑ رگڑ کر بنائے ہوئے ہیں۔ کھُردرے اور چکنے ہتھیاروں کا مقابلہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اِن پرانے آدمیوں نے پتھر کے کھُردرے ہتھیاروں کو بنانا سیکھا۔ اور بعد میں تجربہ بڑھنے پر کھُردرے ہتھیاروں

کی جگہ صاف اور چکنے ہتھیار بنانے لگے۔ اسی لئے کھُردرے ہتھیاروں کے زمانے کو پُرانے پتھر کا زمانہ اور صاف و چکنے ہتھیاروں کے زمانے کو نئے پتھر کا زمانہ کہتے ہیں۔

عجائب گھروں میں آپ کو پتھر کے زمانے کے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ایسے پتھر کے کلھاڑے اور چاقو بھی ملیں گے جنھیں موجودہ زمانہ کی بعض وحشی قومیں استعمال کیا کرتی ہیں۔ یہ ہتھیار پتھر کے زمانہ کے ہتھیاروں سے بہت ملتے جلتے ہیں اور اُن کی طرح ہی صاف اور چکنے بھی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پتھر کے زمانہ کے لوگوں کا رہن سہن بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ آج کل کی وحشی قوموں کا ہے۔

ہمارے جنگلی اور وحشی بزرگوں نے پتھر کے ہتھیار بنانا سیکھ لینے کے بعد ایک اور ترقی کی یعنی اُنھوں نے دھاتوں کا استعمال کرنا سیکھا۔ سب سے پہلی دھات جو اُنھوں نے استعمال کی وہ تانبہ تھا۔ اس کے بعد دوسری دھات پیتل جو تانبہ اور جست ملانے سے بنتی ہے تیار کی۔ اس طرح وہ پتھر کے زمانے سے نکلکر رفتہ رفتہ دھات کے زمانہ میں آ گئے۔

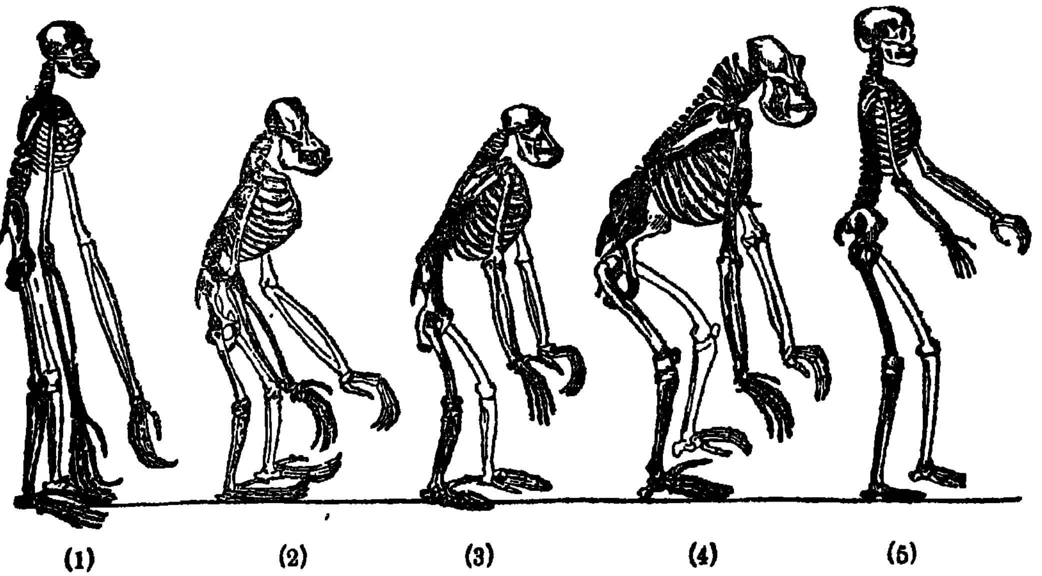
ہم چاہتے تھے کہ ترقی کے وہ تمام مرحلے جو ہمارے آبا و اجداد نے آہستہ آہستہ طے کئے ہیں اُن کا مفصل بیان کریں۔ ہم یہ بتاتے کہ کس طرح اُنھوں نے درختوں کے تنوں سے کشتیاں۔ بارش اور اولوں سے بچنے کے لئے جھونپڑیاں مٹی سے برتن تیار کئے۔ اور ان کی سب سے پہلی پوشاک کیسی تھی لیکن یہ قصہ اتنا طویل ہے کہ ایک دوسری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ بہر حال یہ تو ظاہر ہی ہے کہ کسی زمانہ میں انسان پہلی جماعت کے ایک بچہ کی طرح تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ترقی اور بہتری کے درجے طے کر رہا تھا۔ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھتا رہتا تھا۔ خدا کی یہ وسیع کائنات اُس کا سکول تھا اور سبق کو اچھی طرح یاد نہ کرنے کی

سزا بھوکوں مرنا یا کسی جنگلی جانور کا شکار ہو جانا تھی۔ قدرت نے قدرتی انتخاب کے قانون کے مطابق بے وقوف اور کاہل آدمیوں کو ختم کر کے زیادہ ہوشیار اور چست انسانوں کو چن لیا۔ گو قدرت کے سکول میں سختی بہت ہوتی ہے لیکن اس سے انسان کو ترقی کرنے میں مدد بھی بہت ملتی ہے۔

اگر ہم پتھر کے زمانہ کے آدمیوں کی زندگی کا نظارہ کر سکتے تو ہم دیکھتے کہ اُس زمانہ کے آدمی بہت ہی جاہل اور وحشی تھے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ وہ جانوروں کی طرح رہتے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ ہم وحشیوں کو حیوان کہتے ہیں صرف اس لئے کہ اُن کی بہت سی باتیں حیوانوں کی طرح ہیں۔ اسی طرح پتھر کے زمانہ سے بھی پہلے کے انسان بہت سی باتوں میں حیوانوں سے بھی گرے ہوئے تھے۔ یہی حیوانی انسان ہمارے سب سے پہلے بزرگ تھے۔ وہ دوسرے جانوروں سے کچھ بہتر تھے۔ اور ایک وحشی سے بھی کم تر درجہ پر تھے۔ شاید آپ محسوس کریں کہ ہم انسان کے آبا و اجداد کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کر رہے ہیں اور اس خیال سے کہ تمام انسان جنگلی انسان کی اولاد ہیں، آپ کچھ ناراض بھی ہو رہے ہوں گے لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ سب سے پہلا انسان کئی ہزار برس پہلے رہتا تھا اور ہم لوگ جو اس کی اولاد ہیں اس عرصہ میں رفتہ رفتہ وحشت سے نکل کر انسانیت کی طرف بڑھتے گئے ہیں۔ گو ایسا بھی ہوا ہے کہ کئی بار ہم راستہ بھول بھول گئے ہیں۔ لیکن ہمارا رُجحان ہمیشہ ترقی ہی کی طرف رہا ہے۔

سب سے پہلے انسان کے باپ دادا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سب سے پہلا انسان کہاں سے آیا؟ اور



انسان اور چند بے دمے بندروں کے ڈھانچے (۱) گبن (۲) اورنگ (۳) چمپانزی (۴) گوریلا (۵) انسان

صفحہ ۸۹ کے سامنے

اُس کے آبا واجداد یا باپ دادا کون تھے؟ یہ سوال آپ کو ایک اور سوال
کی یاد دلائے گا یعنی سب جانور اور پودے کہاں سے آئے؟ اور اگر سب
پودے اور جانور دوسرے قدیم جانوروں اور پودوں سے نکلے ہیں تو کیا
سب سے پہلا انسان بھی دوسرے انسانوں سے ہی نکلا تھا؟ لیکن یہ سوال ہم کو
کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتا کیونکہ سب سے پہلا انسان تو سب سے پہلا انسان ہی ہے
اگر وہ بھی دوسرے انسانوں کی ہی اولاد ہو تو اُسے سب سے پہلا انسان کیسے
کہا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب ہمیں چٹانوں میں دبے ہوئے نشانات دیتے
ہیں۔ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ چٹانوں کی بالائی تہوں میں ہی انسان کے ڈھانچے اور
پتھر کے ہتھیار ملتے ہیں۔ اور زیادہ گہرائی میں ایسے انسانی ڈھانچے ملتے ہیں جن
کی قدامت پتھر کے زمانے سے بھی پہلے کی ہے۔ یہاں پر جب ہم انسانی ڈھانچے
کہتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب ایسے جانداروں کے ڈھانچوں سے ہے
جو دوسرے جانداروں کی نسبت انسانی ڈھانچوں سے بہت زیادہ
ملتے جلتے ہیں چنانچہ سب سے پہلے انسان کے باپ دادا صحیح طور پر مکمل انسان نہ
تھے۔ بلکہ وہ ایسے جاندار تھے جو انسان کی صورت میں تبدیل ہو رہے ہوں۔
سامنے نقشے میں ہڈیوں کے ڈھانچوں پر نظر ڈالنے سے آپ کو ان میں بہت
زیادہ مشابہت معلوم ہوگی۔ یہ سب کے سب فوجی رنگروٹوں کی قطار سی معلوم
ہوتے ہیں۔ جن میں بعض نے چلتے وقت سر کو اونچا رکھنا نہیں سیکھا۔ ان میں نمبر ۱
اور نمبر ۵ سب کی نسبت سیدھے کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نمبر ۲ نمبر ۳
اور نمبر ۴ کے جبڑے بناوٹ میں بھدے ہیں۔ نمبر ۱ کا جبڑا ایسا زیادہ بڑا
نہیں لیکن نمبر ۵ کے جبڑے جیسا اچھا بھی نہیں۔ اس کے علاوہ نمبر ۱ کے
زمین تک لمبے بڑے بڑے بازو ہیں۔ اسی طرح اگر آپ غور سے ان کا مقابلہ

کریں گے تو اور بھی کمی فرق نظر آئیں گے۔ مگر ان اختلافات کے باوجود یہ پانچوں ڈھانچے ایک دوسرے سے کافی مشابہت رکھتے ہیں۔ ان سب میں ایکطرح کی خاندانی مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان سب میں بازوؤں۔ ٹانگوں۔ کولھوں ریڑھ کی ہڈیوں۔ پسلیوں۔ کھوپڑیوں اور جبڑوں کی ہڈیوں کی تعداد یکساں ہے یہ سب ایک ہی نمونہ پر بنائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس خاندانی اور جسمانی مشابہت سے صاف ظاہر ہے کہ گبن۔ اورینگ۔ چمپانزی۔ گوریلا یہ تمام بے دُمے بندر اور خود انسان ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انسان ان بے دُمے بندروں میں سے کسی ایک سے نکلا ہے بلکہ یہ تمام جانور اور انسان ایک ہی باپ دادا کی اولاد ہیں۔ آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ پانچوں جاندار ایک دوسرے سے اتنے زیادہ مختلف نہیں ہیں جتنا کہ کبوتروں کی قسموں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیسے کبوتروں کی تمام قسمیں جنگلی کبوتر سے نکلی ہیں ویسے ہی تمام قسم کے بندر اور انسان کسی ایک قسم کے جنگلی جانور کی اولاد ہیں۔ جب انسان کو یہ پتہ نہ تھا کہ جانوروں کی نسلیں کیسے بدلتی ہیں اُس وقت اگر یہ کہا جاتا کہ بندر اور انسان ایک ہی باپ دادا کی اولاد ہیں تو اُس پر کوئی یقین نہ کرتا۔ لوگ کہتے کہ یہ ناممکن ہے کہ بندر اور انسان آپس میں چچیرے بھائی ہوں۔ مگر آپ نے ایسے انسان تو دیکھے ہوں گے کہ جن کے جسم پر بے شمار بال ہیں۔ اور جن کی صورت بندر یا بن مانس سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اسی طرح ایسے جنگلی آدمی بھی موجود ہیں جن کی عادتیں بالکل جانوروں کی سی ہیں۔ وہ الف ننگے رہتے ہیں۔ غاروں میں یا پرندوں کے گھونسلوں جیسی بے ڈھنگی جھونپڑیوں میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن کی سمجھ ایک سدھائے ہوئے کتے سے بھی کم ہوتی ہے۔ اب اگر بندر کو دیکھا

جائے تو اُسے انسانوں کی طرح حرکات کرنا سکھایا جا سکتا ہے۔ ایک چمپانزی (بے دُمے بندر کی ایک قسم) تو انسان کی طرح مُنہ دھونا۔ خود کپڑے پہننا۔ چھُری کانٹے کا استعمال کرنا۔ چائے کے پیالہ سے چائے پینا۔ تولیہ سے مُنہ پونچھنا اور حُقّہ تک پینا خوب اچھی طرح سیکھ گیا تھا۔ دوسرے جانور مثلاً کُتا۔ ریچھ۔ ہاتھی وغیرہ کو بھی کئی طرح کے کرتب سکھائے جا سکتے ہیں۔ مگر وہ بندر کی طرح انسانی حرکات کی ہوبہو نقل نہیں کر سکتے۔

انسان اور بے دُمے بندر

بے دُمے بندروں (anthropiod apes) کے دانت بالکل انسان کے دانتوں کی طرح ہوتے ہیں۔ انسان کی طرح اُن کے دُم بھی نہیں ہوتی۔ نہ ہی اُن کے گالوں میں دُمدار بندروں کی طرح کھانا جمع کرنے والی گل تھیلیاں (Pouches) ہوتی ہیں۔ اُن کے بچّوں کے بھی پہلے دودھ کے دانت ٹوٹتے ہیں۔ پھر قائم دانت نکلتے ہیں بچپن میں انسانی بچّوں کے جب دانت نکلتے ہیں تو جس طرح بخار یا دوسری تکلیفوں سے وہ پریشان ہوتے ہیں اسی طرح ان بندروں کے بچّوں کی بھی حالت ہو جاتی ہے۔ اُن کی قدرتی خوراک پھل اور پتّے ہیں۔ لیکن گوشت کھلانے پر اُس کے بھی عادی ہو جاتے ہیں۔ رات کو سونے کے لئے درختوں پر پتّے اور ٹہنیوں کا بستر سا بنا لیتے ہیں۔ بے دُمے بندروں کی تمام قسموں میں چمپانزی انسان سے شکل وصورت میں بہت زیادہ مِلتا جُلتا ہے۔ عام طور پر اس کا قد ۵ فٹ لمبا ہوتا ہے انسانی جسم میں چھوٹی بڑی سب ملا کر ۲۰۶ ہڈیاں ہیں۔ اور اتنی ہی ہڈیاں بے دُمے بندر میں بھی ہیں! اسکے علاوہ ہر ہڈی کے ساتھ لگی ہوئی شریان و ورید اور دوسرے پٹھے بھی ایک ہی جیسے ہیں۔ دماغ کی بناوٹ کا ڈھنگ بھی انسان اور بے دُمے بندروں میں ایک ہی جیسا ہے

انسان اور بے دُمے بندر میں فرق

بے دُمے بندر اور انسان کے فرق سے ہمارا مطلب کھال کے رنگ۔ بالوں کی زیادتی۔ انگوٹھے کی بناوٹ اور ایسی دوسری چیزوں سے نہیں ہے جو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمارا منشا اصلی فرق سے ہے۔ ڈھانچوں کے نقشہ پر پہلی نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ گبن (Gibbon) کے ہاتھ انسان کے ہاتھوں سے بہت زیادہ لمبے ہیں۔ بعض آدمیوں کے ہاتھ بھی اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ وہ گھٹنوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن صرف ہاتھ کی لمبائی سے ہی اُن کی حرکات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ گبن کی طرح حرکات نہیں کرتے۔ اگر نقشے کو غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ نمبر ۱ کی کھوپری نمبر ۵ کی نسبت چھوٹی اور چپٹی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گبن کا دماغ بھی انسان کے دماغ سے چھوٹا ہے۔ اور یہی حقیقی فرق ہے۔ اعلیٰ دماغی ہی انسان اور حیوان میں سب سے بڑا فرق ہے۔ عقل کی قیمت قوت سے زیادہ ہے۔ ہاتھی نہایت طاقتور اور عظیم الجثہ ہونے سے انسان کو اپنے پاؤں کے نیچے روند سکتا ہے یا اپنی سونڈ سے پکڑ کر زمین پر پٹخ سکتا ہے۔ لیکن انسان اپنی دماغی فوقیت سے ہاتھی کو سدھا کر اُس سے خدمت لیتا ہے۔ اسی لئے انسان خود کو اشرف المخلوقات کہتا ہے۔

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ پتھر کے زمانہ کے لوگ آجکل کی جنگلی قوموں سے بہت ملتے جلتے تھے۔ تہذیب یافتہ انسانوں کے دماغ کا حبشیوں کے دماغ سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ مہذب انسان کا دماغ اُن کی نسبت زیادہ پیچیدہ اور بڑا ہے۔ اسی طرح موجودہ انسان کا دماغ پتھر کے زمانہ کے انسان کے دماغ کی نسبت بڑا اور ترقی یافتہ ہے۔ مگر پتھر کے زمانہ سے پہلے کے

انسانوں کے جو فاسلز ملتے ہیں اُن کی کھوپری پتھر کے زمانہ کے انسانوں کی کھوپری سے بھی چھوٹی تھی حقیقتاً اُن لوگوں کے دماغ اتنے چھوٹے تھے کہ وہ زمانۂ پتھر کے وحشیوں کی نسبت بے دُمے بندروں کے دماغ سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اُس زمانہ میں جو لوگ رہتے تھے وہ آدھے بندر اور آدھے انسان تھے۔ اور وہ غالباً گبن کے سب سے نزدیکی چچیرے بھائی تھے۔

ہمارے آبا و اجداد ـــــــ انسانی بندر

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ سب سے پہلا انسان ایسے جانوروں کی اولاد تھا جو نہ بندر تھے نہ انسان۔ بلکہ وہ آدھے بندر اور آدھے آدمی یعنی انسانی بندر (Man-ape) تھے۔ اور وہ دماغ کی ترقی کے ساتھ رفتہ رفتہ انسان بنتے گئے۔ جس طرح پتھر کے زمانہ میں قدرت نے بے وقوفوں کو ختم کر کے عقلمندوں کو چُن لیا تھا۔ اُسی طرح انسانی بندر کے زمانہ میں بھی زیادہ ہوشیار انسانی بندروں کو چُن لیا۔ اور اُن کو دماغی ترقی کرنے میں مدد دی۔ چنانچہ قدرتی انتخاب کے ذریعہ انسانی بندر سے انسان پیدا ہو گیا۔

کیا آپ ناراض ہیں؟

ہمارے خیال میں اب آپ انسانی بندر کے خاندان کی شروعات کو بھی سمجھ سکیں گے۔ یہاں تک کہ ہم اُن جانداروں تک پہنچ جائیں گے جو انسان اور بے دُمے بندر دونوں کے باپ دادا تھے۔ پیشتر اس کے کہ وقت کی سیڑھی سے اور نیچے اُتریں ہم اُن لوگوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جو یہ

سُنکر بگڑ جاتے ہیں کہ انسان بندر جیسے جانور کی اولاد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا دادا بندر نہیں تھا۔ اور اتنے آگ بگولا ہو جاتے ہیں کہ وہ اُن زبردست ثبوتوں پر نظر ڈالنے سے بھی انکار کر دیتے ہیں جو قدرت کی چٹانی کتابوں میں ملتے ہیں اُن کی مثال اُس پادری کی طرح ہے جس نے گلیلیو کی دُوربین میں سے دیکھنے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ شاید وہ آسمان میں کوئی ایسی بات دیکھ لے جس سے اُسے اپنے خیالات بدلنا پڑیں۔ وہ پُرانا عقیدہ جو انجیل اور دیگر مقدس کتابوں میں ملتا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان ایک قسم کا فرشتہ تھا۔ اُس نے کچھ غلطی کی تھی جس کی پاداش میں اُسے فرشتہ کے رُتبہ سے گرا کر انسان بنا دیا گیا۔ اُس زمانہ کے لوگ جب کہ یہ کتابیں بنی تھیں چٹانی کتابوں کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اُنھوں نے زمین میں دبی ہوئی اُن کھوپریوں کو نہ دیکھا تھا جو انسان اور بندر کے درمیان ایک جڑا ہوا سلسلہ ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے وہ فرشتہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ جو انسان بنا کر زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ انسان کبھی نہیں گرا۔ بلکہ وہ لگاتار اوپر کی طرف چڑھ رہا ہے۔ فرشتہ چاہے حیرت ناک چیز ہو لیکن کیا وہ انسانی بندر سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے جو لاکھوں برس پہلے رفتہ رفتہ انسان کی طرح بننے لگا حتیٰ کہ بالکل انسان بن گیا؟ جب ہم اُس لمبے سفر پر غور کرتے ہیں جو انسان نے انسانی بندر سے مکمل انسان بننے میں طے کیا ہے تو ہمارے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلا آدمی ایک قسم کا فرشتہ یا دیوتا تھا۔ کیونکہ فرشتہ سے گر کر انسان بننا کوئی بڑائی کی بات نہیں۔ بلکہ فخر تو اس میں ہے کہ انسان نے ایک حیوان سے ترقی کی اور اشرف المخلوقات بن گیا۔

تمام جانوروں کا دادا پڑدادا کون تھا؟

چینی لوگ ہاتھی دانت کی نہایت حیرت انگیز چیزیں بناتے ہیں۔ اُن میں سے ایک عجیب چیز وہ بکس ہے جس کے اندر ایک اور چھوٹا بکس ہوتا ہے۔ اور اُس چھوٹے بکس کے اندر اُس سے بھی چھوٹا بکس ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر بکس میں سے اس سے چھوٹا بکس نکلتا آتا ہے۔ یہاں تک کہ سب سے چھوٹے بکس کے اندر ایک ذرا سا ہاتھی دانت کا بکس نما ٹکڑہ نکلتا ہے۔ اس کتاب کے باب بھی بالکل اُسی بکس کے مانند ہیں۔ کیونکہ اس میں ایک سوال سے دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے جب ہم ایک سوال کو حل کر لیتے ہیں تو اُس جواب میں سے ایک نیا سوال نکل آتا ہے۔ پچھلے باب میں ہم نے سب سے پہلے آدمی کے بارے میں چند باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے بتایا کہ سب سے پہلا آدمی وحشی تھا۔ جو انسانی بندر سے پیدا ہوا تھا۔ اور یہ انسانی بندر اُن بے دُمے بندروں سے نکلا تھا جو آج سے لاکھوں برس پہلے دُنیا میں موجود تھے۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ یہ بیدُمے بندر کہاں سے آئے۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح انسان۔ انسانی بندر پر ایک ترقی کا درجہ تھا۔ اور یہ انسانی بندر اُس بیدُمے بندر سے ترقی کر کے آیا تھا جس کے آجکل صرف فاسلز اور پتھرائی ہوئی ہڈیاں ہی ملتی ہیں۔ اس دوران میں جاندار ترقی کی سیڑھی پر چڑھ کر انسان کے درجہ تک پہنچ رہے تھے۔ وہ لگاتار مگر رفتہ رفتہ اُونچائی کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ وہ منکشف ہو رہے تھے یعنی اُن کا وکاس ہو رہا تھا۔ جانداروں کے اس وکاس کو قانونِ ارتقا یا وکاس واد (Organic evolution) کہتے ہیں۔

بے دُمے بندروں کے باپ دادا ایسے جانور تھے جو اُن کی طرح چالاک اور ہوشیار نہ تھے۔ اس کا پتہ ہمیں اُن چٹانی کتابوں کو دیکھنے سے ملتا ہے جن میں ایسے جانوروں کے نشانات ملتے ہیں جو بندروں سے بہت پہلے دُنیا میں موجود تھے اور بہت سی باتوں میں اُن سے ملتے جُلتے بھی تھے۔ اُن جانوروں کو ہم لیمر کہتے ہیں۔ آجکل بھی لیمر کی بہت سی قسمیں ملتی ہیں۔ یہ زیادہ تر میڈگاسکر میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن چٹانی کتابوں کے لیمر موجودہ زمانہ کے لیمروں سے بہت مختلف ہیں۔ حالانکہ یہ اُن ہی کے پوتے پڑپوتے ہیں۔ چٹانی لیمروں کے باپ دادا تمام لیمروں اور چٹانی بے دُمے بندروں کے آبا و اجداد تھے۔ اور یہ چٹانی بے دُمے بندر اُن انسانی بندروں کے بزرگ تھے جن سے کہ انسان نکلا ہے۔

لیمر (Lemur) ایک عجیب قسم کا جانور ہے۔ ان میں سے بعض تو بندروں کی طرح ہوتے ہیں اور بعض بلی سے ملتے جُلتے ہیں۔ لیمر کے لفظی معنیٰ بھوت کے ہیں۔ اس جانور کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ یہ صرف رات کو ہی باہر نکلتا ہے۔ اور اس کے چلنے میں آہٹ بھی نہیں ہوتی۔ لیمر کو نیم بندر بھی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندر سے بہت ملتے ہیں یہ درختوں پر رہتے ہیں اور دن چھپنے پر اپنی خوراک کی کھوج میں نکلتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پرندے اور کیڑے مکوڑے ان کی خوراک ہیں۔

لیمر کے رشتہ دار

جب ہم لیمر کے رشتہ داروں کی کھوج کرتے ہیں تو ہم عجیب و غریب جانوروں کے گروہوں تک پہنچتے ہیں۔ اگر آپ پہلے سے نہ جانتے ہوتے

کہ کس طرح ایک قسم کا جانور بہت سی قسموں میں تبدیل ہو جاتا ہے تو شاید آپ مندرجہ ذیل باتوں کا یقین بھی نہ کرتے۔ لیمر کے آبا و اجداد کے خاندان میں مختلف قسم کے جانور شامل ہیں۔ لیمر کے رشتہ داروں میں ایسے جانور بھی ہیں جنھیں ہم کرم خور کہتے ہیں۔ آجکل کرم خور جانور چھچھوندر، ساھی اور کرم خور چوہے کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جانور چٹانی کرم خور جانوروں سے کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی چٹانی کرم خور جانوروں سے پانچ مختلف قسم کے جانوروں کے خاندانوں کا آغاز ہوا ہے جو سب دودھ پلانے والے جانور ہیں۔ پہلے خاندان میں شیر، چیتے، بلی، کتے، بھیڑیئے۔ وغیرہ درندے ہیں۔ جو گوشت خور ہیں۔

دوسرا خاندان چرندوں کا ہے جس میں گھوڑا۔ ہرن۔ ہاتھی وغیرہ تمام کھردار جانور شامل ہیں۔ یہ سب گھاس کھاتے ہیں۔

تیسرا خاندان زمین میں بل بنانے والے جانوروں کا ہے۔ جس میں خرگوش، چوہے، چھچھوندر وغیرہ شامل ہیں۔

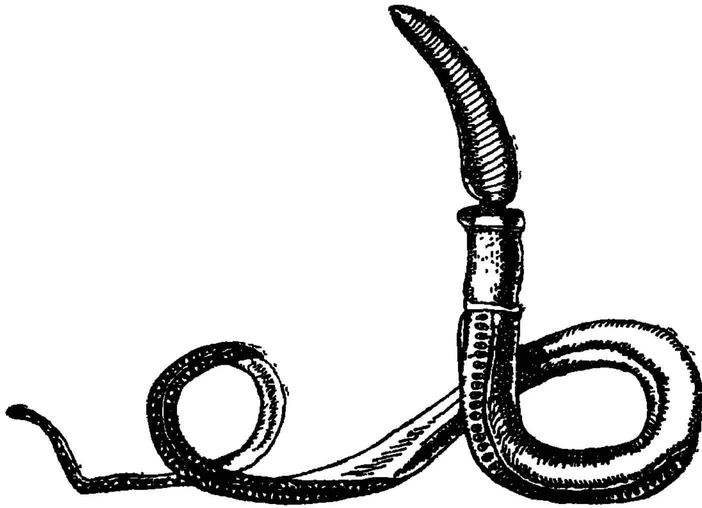
چوتھا خاندان چمگادڑوں کا ہے۔ جو ہوا میں اُڑتے ہیں۔ کیڑے مکوڑے اور پھل اُن کی خوراک ہیں۔

پانچواں خاندان اُن جانوروں کا ہے جو درختوں پر رہتے ہیں۔ اس خاندان میں لیمر اور تمام قسم کے دُمدار اور بے دُمے بندر شامل ہیں۔ ان بے دُمے بندروں سے ہی انسانی بندر نکلے ہیں۔ جن سے انسان کا وکاس ہوا۔

حالانکہ ہم نے ان جانداروں کا ذکر چند سطروں میں کیا ہے۔ لیکن ان سب کو ابتدائی آبا و اجداد سے اتنی قسموں اور خاندانوں میں پھیلنے میں لاکھوں برس کا عرصہ لگ گیا۔ پچھلے صفحات کو پڑھ کر آپ جان ہی چکے ہیں کہ کس طرح

قدرتی انتخاب سے ایک جانور سے بہت سی قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر اتنا تو ہم آپ کو سمجھا ہی دینا چاہتے ہیں کہ کس طرح اُن چٹائی کرم خور جانوروں سے مندرجہ بالا پانچوں خاندانوں کا آغاز ہوا ہوگا۔ فرض کرو کہ اُن میں سے کچھ جانور خوراک کی تلاش میں گھومتے ہوئے کسی ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں اُن کو وہ خوراک نہیں ملتی جس کے وہ عادی ہیں۔ اُنھیں مجبور ہو کر اپنی عادت کے خلاف نئی قسم کا چارہ کھانا ہوگا یا اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے ہوں گے چنانچہ وہ جو بھوک سے مجبور ہو کر دوسرے جانوروں کو مار کر کھانے لگے درندے بن گئے۔ اور رفتہ رفتہ اُن کی ضرورت کے مطابق قدرت نے اُنھیں نکیلے دانت۔ مضبوط پنجے۔ اور تیز سونگھنے کی قوت بخش دی۔ وہ جو زیادہ طاقتور نہ تھے گھاس اور پتے کھا کر گذارہ کرنے لگے۔ اور آہستہ آہستہ چوڑے دانتوں والے۔ امن پسند گھاس خور جانوروں میں تبدیل ہو گئے۔ اُن میں سے بعض قسموں نے جنگلی گھوڑوں کی طرح گروہ بنا کر رہنے میں ہی سلامتی دیکھی۔ کچھ دشمنوں کے ڈر سے خرگوش کی طرح زمین میں بل بنا کر رہنے لگ گئے

قدرت کا یہ قانون کہ تبدیلی حالات پر منحصر ہے، ہر جگہ یکساں کام کرتا ہے وہ جانور جو ہوا میں سے مکھیاں اور بھنگے پکڑ کر کھانے کی کوشش کرنے لگے اور اس کے لئے اُنھیں ہوا میں اُچھلنا پڑا رفتہ رفتہ چمگادڑ جیسے جانوروں میں تبدیل ہو گئے۔ جو جانور دشمنوں سے بچنے اور پھل کھانے کے لئے درختوں پر چڑھنے لگے۔ قدرت نے شاخوں سے جھولنے اور ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر کودنے کے لئے اُن کے پنجوں کو اور بڑا کر دیا۔ مندرجہ بالا تمام تبدیلیاں اتنی آہستہ آہستہ ہوئی ہیں کہ اگر ہم اُس وقت موجود بھی ہوتے تو اپنی زندگی میں اُن بدلتے ہوئے جانوروں میں کوئی بھی فرق محسوس نہ کرتے۔ خواہ ہماری



کیچو مچھلی :- اس کیچوے کے گلے میں مچھلی کی طرح گلپھڑے ہوتے ہیں۔ یہ کیچوؤں اور مچھلیوں کے درمیان ارتقائی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

(الف) تصویر متعلقہ مضمون صفحہ ۹۹



بطخی چھچھوندر :- اس کا جسم تو چھچھوندر کی طرح ہے مگر چونچ بطخ کی سی ہے۔ گو یہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے والے جانوروں کی طرح ہی دودھ پلاتا ہے لیکن یہ رینگنے والے جانوروں کی طرح انڈے دیتا ہے۔

(ب) تصویر متعلقہ مضمون صفحہ ۱۱۵

عمر سو سال کی کیوں نہ ہوتی۔ ہاں اگر ہم ایک ہزار برس تک زندہ رہ سکتے تو کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوتے ہوئے ضرور دیکھ سکتے!

مندرجہ بالا پانچوں خاندانوں کے جانوروں کو ہم دودھ پلانے والے جانور (Mammals) کہتے ہیں۔ یہ سب بچے دیتے ہیں انڈے نہیں دیتے۔ اور مادہ بچوں کو اپنا دودھ پلا کر پرورش کرتی ہے۔ انسان بھی ایک دودھ پلانے والا جانور ہی ہے۔ جب ہم دُنیا کے تمام دودھ پلانے والے جانوروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں آسٹریلیا میں دو عجیب قسم کے جانور ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام بطخی چھچھوندر (Duck mole) اور دوسرے کا نام اکی ڈنا (Echidna) ہے۔ بطخی چھچھوندر کا جسم چھچھوندر کی طرح اور چونچ بطخ جیسی ہوتی ہے۔ ان جانوروں میں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ گو یہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے والے جانوروں کی طرح دودھ پلاتے ہیں لیکن ان کے بچے دودھ پلانے والے جانوروں کی طرح پیدا نہیں ہوتے۔ یہ جانور کتیا کی طرح پلّے نہ دے کر رینگنے والے جانوروں یا پرندوں کی طرح انڈے دیتا ہے۔ ان دو جانوروں کے علاوہ وہ سب جانور جو انڈا دیتے ہیں یا تو رینگنے والے ہیں یا پھر پرندے ہیں یعنی ان میں سے کوئی بھی اپنے بچوں کو بطخی چھچھوندر کی طرح دودھ نہیں پلاتا۔ بطخی چھچھوندر اور اکی ڈنا ہی دو ایسے جانور ہیں جو دیتے تو انڈے ہیں مگر اپنے بچوں کو تھندار جانوروں کی طرح دودھ پلاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جانور کسی رینگنے والے جانور سے ہی نکلے ہیں۔ اس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ رینگنے والے جانور ہی ترقی کر کے بطخی چھچھوندر جیسے جانور بنے اور رفتہ رفتہ دودھ پلانے والے جانوروں کی مختلف قسموں میں تبدیل ہو گئے۔ ان تھندار جانوروں میں وہ بیدمانند رکھی تھا جو ترقی کر کے انسانی بندر بنا اور اس انسانی

بندر سے انسان کا وکاس ہوا۔ چنانچہ یہ ایک ایسا ارتقائی سلسلہ ہے جو ہمیں انسان سے لے کر سیدھا رینگنے والے جانوروں تک پہنچا دیتا ہے اس سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان سانپ سے نکلا ہے۔ مگر چٹانی کتابوں کے مطالعہ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ تمام دودھ پلانے والے اور رینگنے والے جانور کسی ایسے جانور سے نکلے ہیں جو کروڑوں برس پہلے کسی رینگنے والے جانوروں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ رینگنے والے جانوروں کا زمانہ آج سے تقریباً آٹھ کروڑ ۸۰٬۰۰۰٬۰۰۰ برس پہلے تھا۔

پرندے اور رینگنے والے جانور دونوں انڈے دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان دونوں خاندانوں کا آپس میں نزدیکی رشتہ ہے۔ جب ہم چٹانی کتابوں میں ابتدائی پرندوں کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں ایسے رینگنے والے جانوروں کے فاسلز یا پتھرائی ہوئی ہڈیاں ملتی ہیں جو پرندوں کی صورت میں تبدیل ہو رہے ہوں۔ اُن کی کھال کی کینچلی لمبی اور ملائم ہو کر پروں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ لیکن پروں کے کناروں پر ابھی پنجے باقی تھے۔ مُنہ کی جگہ چونچ بن گئی تھی۔ مگر ابھی اُس میں دانت موجود تھے۔ حالانکہ اس وقت دنیا میں ایسا کوئی پرندہ نہیں ہے جس کی چونچ میں دانت ہوں۔ لیکن ایسا پرندہ جس کے پروں پر پنجے ہوں اب بھی امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ شروع میں یہ ابتدائی پرندے ایک درخت سے دوسرے درخت تک ہی اُڑ سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ہوا میں زیادہ دیر تک اُڑنے لگے۔ اس طرح یہ پرند نما رینگنے والے جانور آہستہ آہستہ پرندوں کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ اور حالات کے مطابق یہی ابتدائی پرندے مختلف نسلوں میں پھیلتے گئے۔ یہ تمام تبدیلیاں آج سے پندرہ کروڑ برس پہلے شروع ہو گئی تھیں۔ کیونکہ ان ابتدائی پرندوں سے نئی نئی قسم کے پرندے

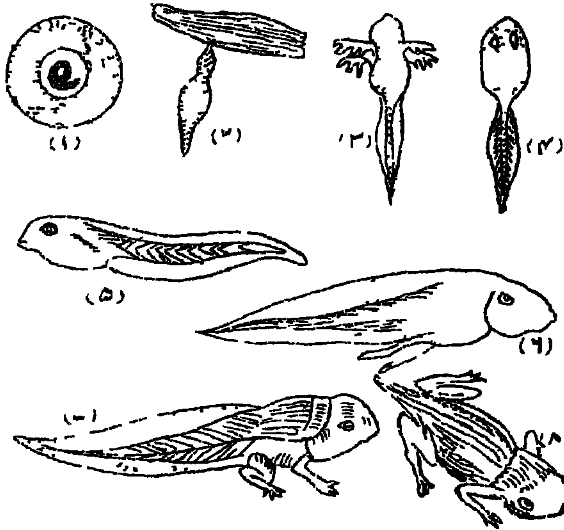
ہی نکلتے رہے ہیں اس لیئے پرندوں کے ذکر کو چھوڑ کر ہم پھر اس سوال کے حل کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ انسان کی ابتدا کیا تھی ؟

رینگنے والے جانور کہاں سے نکلے ؟

تمام رینگنے والے جانور ایسے جانوروں سے نکلے ہیں جو خشکی اور پانی میں دونوں جگہ زندہ رہ سکتے تھے۔

چٹانی کتابوں کے ایک حصہ میں صرف خشکی اور پانی میں رہنے والے اور رینگنے والے جانوروں کے ہی نشانات ملتے ہیں۔ اُن میں بعض تو نہایت ہی بدصورت اور بھدی شکل کے ہیں۔ مینڈک بھی خشکی و تری میں رہنے والے یعنی دو عنصری (amphibians) جانوروں میں سے ایک ہے۔ اس لیئے مینڈک کی زندگی سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ چٹانی دو عنصری جانور کس طرح رہتے ہوں گے۔ مینڈک کا بچپن تو پانی میں ہی گذرتا ہے مگر بعد میں وہ پانی کے کنارے خشکی پر۔ ہنے لگتا ہے۔ مینڈکی پانی میں انڈے دیتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد اُن میں سے بچے نکل آتے ہیں۔ اُن کی شکل وصورت اور بناوٹ بالکل مچھلی جیسی ہوتی ہے۔ مچھلیوں کی طرح اُن کے سانس لینے کے لئے گلپھڑے اور جسم پر پَر (Fins) ہوتے ہیں۔ اگر اُن کو پانی میں سے نکال کر زمین پر رکھ دیا جائے تو تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ مینڈک کا بچہ خاص طریقہ سے بڑھتا ہے۔ پہلے پچھلی ٹانگیں جسم سے باہر نکلتی ہیں اور پھر اگلی ٹانگیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ اس کی مچھلی کی سی دُم آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتی ہے۔ دُم کے غائب ہونے کے ساتھ ساتھ ہوا میں سانس لینے کے لئے اس کے جسم میں پھیپھڑے بننے لگ جاتے ہیں۔ اور گلپھڑوں کی درزیں بند ہونے لگتی ہیں

رفتہ رفتہ یہ اپنا پہلا روپ بدل کر مینڈک بن جاتا ہے اور زمین پر پھدکنے لگتا ہے۔ اب یہ مینڈک مچھلی کی طرح پانی میں نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس کے وہ گلپھڑے جن سے وہ پانی میں سانس لیتا تھا ختم ہو چکے ہیں۔ دشمن سے بچنے کے لئے یا شکار کی تلاش میں چاہے وہ پانی میں چلا بھی جائے لیکن پھر بھی اُسے پانی کے اُوپر آکر ہوا میں سانس لینا ہی پڑتا ہے۔



مینڈک کی زندگی کے چند باب:- (۱) مینڈک کا انڈا۔ (۲) مینڈک کا بچہ انڈے میں سے گھاس کی پتی سے چمٹ گیا ہے۔ (۳) مینڈک کا بچہ مچھلی کی حالت میں۔ گردن میں مچھلی کی طرح گلپھڑے موجود ہیں۔ (۴) اور (۵) بچہ پرورش پاکر بڑا ہو رہا ہے۔ (۶) پچھلی ٹانگیں نمودار ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ (۷) اگلی ٹانگیں بھی نکل آئیں (۸) پورا مینڈک بن جانے کے قریب۔ اور جب اُس کی دُم بالکل غائب ہو جائے گی تو یہ مکمل مینڈک بن جائے گا۔ مینڈک ایک دو عنصری جانور ہے کیونکہ خشکی اور پانی میں دونوں جگہ رہ سکتا ہے۔

مینڈک کی زندگی سے ظاہر ہے کہ وہ جانور جو کبھی زندگی کا کچھ حصہ پانی میں اور کچھ خشکی پر گذارتے تھے حالات کے بدل جانے پر صرف خشکی پر ہی رہنے لگے۔ ایسا ہو جانا کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر سمندر کی تہہ پانی کی سطح سے اوپر ابھر آئے تو اس حصہ کے دو عنصری جانور صرف خشکی پر ہی رہنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ اور ان کو نئے حالات کے مطابق اپنی عادات کو بھی بدل دینا پڑے گا چنانچہ تمام دو عنصری جانور حقیقتاً ایسے جانداروں کی اولاد ہیں جو کبھی ہر وقت پانی میں رہتے تھے۔ اس بات کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ دنیا میں ایسی مچھلیاں موجود ہیں جو پانی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہیں (Climbing Perch) ایک اسی قسم کی مچھلی ہے جو اپنے لمبے لمبے کانٹے دار پروں سے درخت کے اوپر تک چڑھ جاتی ہے۔ اور درخت پر چڑھنے کی وہ اتنی عادی ہو چکی ہے کہ اگر اس کو ہر وقت پانی میں رکھا جائے تو وہ مر جاتی ہے۔ بحیرۂ ہند اور بحر الکاہل کے ساحلوں پر بھی ایک بڑی بڑی گول آنکھوں والی مچھلی ملتی ہے۔ جو پیڑوں پر چڑھ جاتی ہے۔ مگر زیادہ تر مچھلیاں پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے جسم میں ہوا کے اندر سانس لینے کے لئے پھیپھڑے نہیں ہوتے۔ خشکی پر رہنے والے جانور پھیپھڑوں کے ذریعہ سانس لے کر آکسیجن کو اپنے اندر جذب کرتے رہتے ہیں جس سے خون صاف ہوتا رہتا ہے اور زندگی قائم رہتی ہے۔ اگر سانس لینے کے لئے ہوا نہ ہو تو سب دم گھٹ کر مر جائیں۔ مچھلی میں پھیپھڑوں کی بجائے گلپھڑے ہوتے ہیں جن کے ذریعہ وہ پانی میں ملی ہوئی آکسیجن کو جذب کرتی رہتی ہے۔ اور اگر اس کو پانی سے باہر نکال لیا جائے تو وہ مر جاتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس کو کافی آکسیجن نہیں ملتی۔ بلکہ گلپھڑوں میں پانی نہ جانے سے وہ سوکھ جاتے ہیں۔ اور ان کے مسامات بند ہو جاتے ہیں۔ مسامات بند ہو جانے سے وہ

ہوا کی آکسیجن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتی جس سے اس کا دم گھٹ جاتا ہے ہے۔ چنانچہ مچھلیوں کے گلپھڑے انھیں پانی میں ہی زندہ رکھ سکتے ہیں اور پھیپھڑوں والے جانور صرف ہوا میں یا پانی کے باہر ہی زندہ رہ سکتے ہیں

پھیپھڑ مچھلی (Lung Fish)

یوں تو گلپھڑوں والے آبی جانور سے پھیپھڑوں والے خشکی کے جانور بن جانا نہایت عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چٹانی کتابوں کے مطالعہ سے ہمیں ایسی مچھلیوں کے نشانات ملتے ہیں جو دوعنصری اور رینگنے والے جانوروں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے اس دُنیا میں موجود تھیں۔ ان میں کچھ ایسے عجیب قسم کے جاندار بھی تھے جنھیں ہم پھیپھڑ مچھلیاں کہہ سکتے ہیں۔ ان مچھلیوں کے جسم میں پانی میں سانس لینے کے لئے گلپھڑے اور ہوا میں دم لینے کے لئے پھیپھڑے تھے جس سے وہ مچھلیاں خشکی اور پانی میں دونوں جگہ زندہ رہ سکتی تھیں۔ آجکل بھی آسٹریلیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں ایسی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو دونوں طریقوں سے سانس لیتی ہیں آسٹریلیا کی مچھلی کا نام کیچڑ مچھلی Mud Fish ہے یہ ایسے دریاؤں میں ملتی ہے جو گرمیوں میں پانی نہ رہنے سے سوکھ جاتے ہیں۔ صرف نشیب میں کہیں کہیں کیچڑ اور پانی رہجاتا ہے۔ اس کیچڑ میں سے یہ مچھلی بار بار نکلکر ہوا میں سانس لینے آتی ہے۔ افریقہ اور آسٹریلیا میں ایک اور عجیب قسم کی مچھلی بھی ہے جو پانی اور ہوا دونوں میں سانس لے سکتی ہے۔ اسے پھیپھڑ مچھلی (Lung Fish) کہتے ہیں۔ جب تک ندی میں پانی ہوتا ہے یہ مچھلی بھی دوسری مچھلیوں کی طرح پانی میں رہتی ہے۔ مگر موسم گرما میں دریا کے سوکھ جانے پر یہ کیچڑ میں اپنا گھر بنا لیتی ہے۔ اُس گھر میں ہوا کے آنے جانے کے لئے ایک سُوراخ رکھ لیتی ہے۔ اِس سُوراخ

کے ذریعہ ہوا میں سانس لیتی رہتی ہے۔ جب دوبارہ برسات کے دنوں میں نمی بھر جاتی ہے تو وہ اپنا گھر چھوڑ دیتی ہے۔ ان عجیب قسم کی مچھلیوں سے ہمیں اُن دوہرے سانس والی مچھلیوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جن کے فاسلز چٹانی کتابوں میں موجود ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ دوہرے سانس والی مچھلی یا (پھیپھڑ مچھلی) اور دوعنصری جانور میں صرف ایک درجہ کا ہی فرق ہے۔ دوہرے سانس والی مچھلیاں زیادہ عرصہ تک پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں گو وہ ہوا اور پانی دونوں جگہ سانس لے سکتی ہیں۔ اور دوعنصری جانور پانی میں پیدا ہو کر بعد میں زیادہ تر خشکی پر ہی رہنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہ گلپھڑوں اور پھیپھڑوں والی مچھلی ذراسی ترقی سے ہی دوعنصری جانوروں میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہی مچھلی ایک عام مچھلی اور دوعنصری جانور کے درمیان ارتقائی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہاں پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ گلپھڑوں والی مچھلی میں پھیپھڑے کیسے پیدا ہو گئے جس سے وہ پانی کے باہر سانس لینے کے قابل ہو گئی؟ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں آبدوز کشتی (Submarine) سے مدد لینی ہو گی۔ پن ڈبی ایک طرح کی مچھلی نما کشتی ہے۔ جو چاروں طرف سے اس طرح بند ہوتی ہے کہ ڈبکی لگانے پر اس میں پانی نہیں بھرتا۔ اس کشتی میں چند خانہ ہوتے ہیں جنھیں مرضی کے مطابق پانی سے بھرا یا خالی کیا جا سکتا ہے۔ جب ان خانوں کو پانی سے بھر دیتے تو کشتی اتنی وزنی ہو جاتی ہے کہ وہ ڈوب جاتی ہے جب کشتی کو پانی کے اوپر لانا ہوتا ہے تو ان خانوں میں سے پانی پمپ کے ذریعہ نکال دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ پھر ہلکی ہو کر پانی کے اوپر آجاتی ہے۔ اسی طرح مچھلی کے پیٹ میں بھی ایک تھیلی سی (Floating bladder)

ہوتی ہے جس میں ہوا بھری ہوتی ہے۔ عام طور پر اس تھیلی کو پھکنا کہتے ہیں۔
مچھلی اس پھکنے کو اپنی مرضی کے مطابق چھوٹا یا بڑا کر سکتی ہے۔ ہوا کے بھر جانے
پر جب پھکنا بڑا ہو جاتا ہے تو مچھلی ہلکی ہو کر پانی کے اوپر آ جاتی ہے اور جب
مچھلی پھکنے کو سکیڑ کر ہوا خارج کر دیتی ہے تو وہ پانی کے نیچے چلی جاتی ہے
یہی وہ ذریعہ ہے جس سے مچھلی پانی میں اوپر نیچے آ جا سکتی ہے۔ ایسی بہت
سی وجوہ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مچھلی کا یہ پھولنے اور سکڑنے والا پھکنا
ہی رفتہ رفتہ پھیپھڑوں میں بدل گیا ہے۔ یہ بات مینڈک کے بچے سے بھی
ظاہر ہے۔ مینڈک کا بچہ جب تک مچھلی کی شکل میں رہتا ہے گلپھڑوں سے
سانس لیتا ہے۔ بعد میں اس میں پھیپھڑے بن جاتے ہیں۔ یہ پھیپھڑے اس پھکنے
سے بنتے ہیں جو اس بچے کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ جونہی پھیپھڑے بن چکتے
ہیں اور مینڈک ہوا میں سانس لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وہ خشکی پر آ جاتا ہے
اور ساتھ ہی گلپھڑے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ گلپھڑوں کے نشانات
بھی صاف ہو جاتے ہیں۔ اب یہ جانور صرف ہوا میں ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ اسیطرح
دوہرے سانس والی مچھلیوں کے پھیپھڑے بھی پھکنے سے بنتے ہیں۔ مچھلی کے
پھکنے کو پھیپھڑوں میں تبدیل کرنے کے لیے بہت زیادہ تبدیلی کی ضرورت نہیں۔
ایک معمولی مچھلی سے دوہرے سانس والی مچھلی کے بننے میں تھوڑی سی ترقی درکار
تھی۔

اتنا سمجھ لینے پر اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ زندگی کی ترقی کی سیڑھی
پر قدم بقدم چڑھ سکیں۔ ایک معمولی مچھلی سے دوہرے سانس والی مچھلی۔ دوہرے
سانس والی سے دوعنصری جانور۔ دوعنصری جانور سے رینگنے والے جانور۔ رینگنے
والے جانور سے دودھ پلانے والے جانور۔ دودھ پلانے والے جانور سے

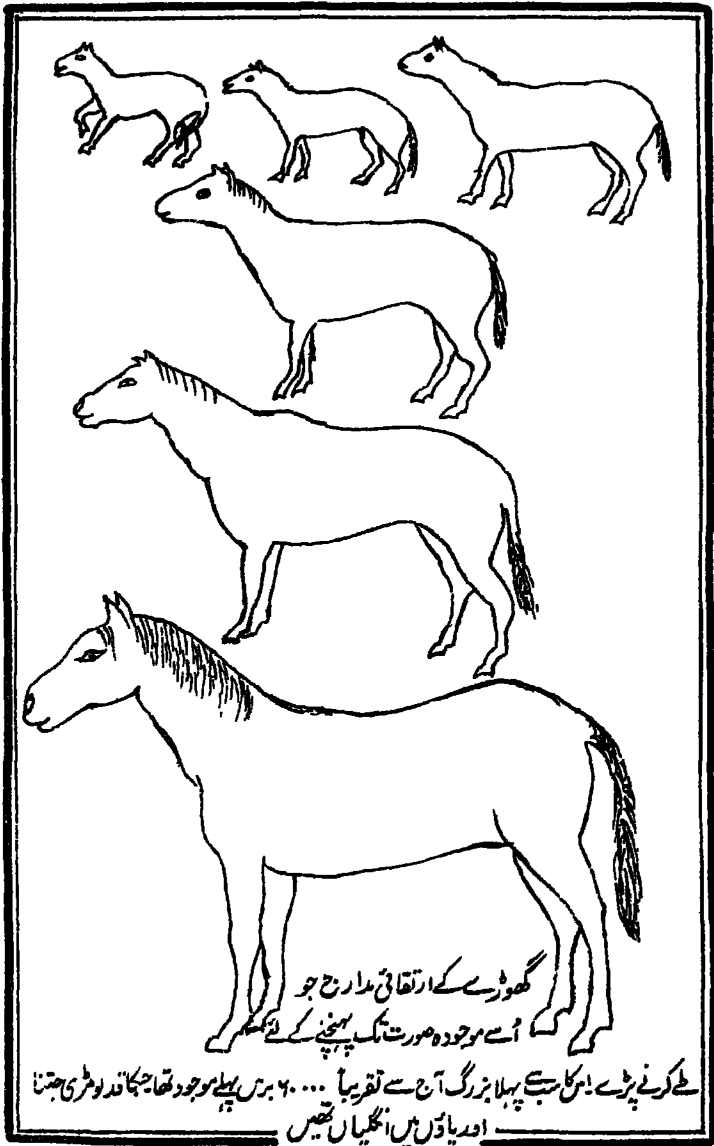
بیدے بندر۔ بیدے بندر سے انسانی بندر۔ اور انسانی بندر سے آخر کار ہم انسان تک پہنچ جاتے ہیں۔ زندگی کو قائم رکھنے میں پانی کی اسی لئے زیادہ اہمیت ہے کہ زندگی کی ابتدا پانی میں ہوئی تھی۔ اسی لئے تمام جاندار پانی سے محبت کرتے ہیں۔

مچھلیوں کے آباواجداد

انسان کا قدیم سے قدیم باپ دادا سمندر میں رہتا تھا۔ اتنا تو ہم جان گئے ہیں لیکن ابھی ہم نے اس سوال کو حل نہیں کیا ہے کہ تمام جانداروں کا سب سے پہلا بزرگ کون تھا؟ چٹانوں میں صرف مچھلی ہی وہ سب سے پہلے جانور نہیں ہیں، جو اپنا نشان چھوڑ گئے ہیں بلکہ مچھلی سے بھی پہلے بہت سے ایسے ادنیٰ جانور موجود تھے جن کے نشانات چٹانوں میں ملتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم اُن ادنیٰ جانوروں کے متعلق کچھ بیان کریں ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ مچھلی بھی ایک ادنیٰ قسم کا ہی جانور ہے۔ مچھلی دیکھ اور سن سکتی ہے۔ ہر وہ مچھلی کا شکاری جو گھنٹوں دریا کے کنارے صبر سے پانی میں بنسی ڈالے ہوئے چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے یہ جانتا ہے کہ شور و شر سے مچھلیاں ڈر کر بھاگ جاتی ہیں۔ لیکن مچھلی پھر بھی کتے کی طرح ہوشیار نہیں ہے۔ اُس میں کتے کی طرح حس نہیں۔ وہ صرف چارہ کے لئے پھرنا اور اپنے دشمن سے حفاظت کے لئے بھاگنا یا چھپنا ہی جانتی ہے۔

جب ہم ایک معمولی مچھلی سے انسان تک وکاس کے سلسلہ کا خیال کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ادنیٰ قسم کے جانور رفتہ رفتہ اعلیٰ جانوروں میں تبدیل ہوتے گئے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ قسم کے جانوروں سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ قسم کے جانور ادنیٰ جانوروں سے زیادہ ہوشیار اور چالاک

ہوتے ہیں۔ ان کی جسمانی بناوٹ خاص کر ان کا دماغ زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے۔
انسان جانداروں میں سب سے اعلیٰ ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کا دماغ سب سے
زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ وہ دماغ کی مدد سے ہی بولتا۔ لکھتا۔ ہتھیار اور اوزار
بناتا نیز سینکڑوں قسم کی حرکتیں کرتا ہے جنھیں انسانی بندر بھی نہیں کر سکتا تھا۔
قدرتی چٹانی کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت کا اصول ہمیشہ
اونچا اور آگے بڑھنا ہی رہا ہے۔ حالانکہ بیسیوں قسم کے جانور مثلاً ڈپلوڈوکس
اکتھیوسارس۔ ڈنوسارس وغیرہ دُنیا سے بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ نیز چیونٹی اور
شہد کی مکھی وغیرہ نے ارتقائی ترقی کرنا بند کر دیا ہے۔ پھر بھی ہم چٹانی کتابوں
کی مدد سے مچھلی سے لے کر انسان تک درجہ وار اس ارتقائی سلسلہ کو دیکھ سکتے ہیں۔
ہیں جو اُن میں کروڑوں برس کے عرصہ میں ہوتی رہی ہیں۔ ہم اُن تمام درجوں کا بھی
مطالعہ کر سکتے ہیں جو پانچ انگلیوں والے لومڑی جتنے ابتدائی گھوڑے کو
موجودہ زمانے کے گھوڑے میں تبدیل ہونے کے لئے طے کرنے پڑے
ہیں۔ اسی طرح سلسلہ وار سینکڑوں ایسے ڈھانچے ملتے ہیں جن سے پتہ
چلتا ہے کہ کس طرح سُور جتنا چھوٹا سا جانور رفتہ رفتہ سونڈ والا بہت بڑا
ہاتھی بن گیا۔ جو خشکی کا سب سے بڑا دُودھ پلانے والا جانور ہے۔ چنانچہ
یہ ترقی ایک سڑک کی مانند ہے جس سے کئی پگڈنڈیاں اِدھر اُدھر چھوٹ گئی
ہیں۔ گو یہ راستہ میں بل کھاتی ہوئی کہیں سے تنگ اور کہیں سے
کشادہ ہوتی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ارتقائی سڑک نہ کہیں راستہ
میں ٹوٹی ہے اور نہ کہیں گم ہوئی ہے۔ بلکہ سیدھا منزل مقصود
تک پہنچا دیتی ہے۔



گھوڑے کے ارتقائی مدارج جو
اُسے موجودہ صورت تک پہنچنے کے لئے کھٹکر
طے کرنے پڑے۔ اس کا سب سے پہلا بزرگ آج سے تقریباً ۶۰۰۰۰ برس پہلے موجود تھا جسکا قد لومڑی جتنا
اور پاؤں میں انگلیاں تھیں

ریڑھ دار جانور ——— Vertebrates

اب تک ہم نے جتنے بھی جانوروں کا ذکر کیا ہے وہ سب ریڑھ دار جانور کہلاتے ہیں۔ انسان سے لے کر مچھلی تک سب جانوروں میں ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ یہی وہ ہڈیوں کا ستون ہے جس کے سہارے جسم کا ڈھانچہ قائم ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کا ستون اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ اُس میں نسوں کے جال کا ایک سلسلہ سا پھیلا ہوتا ہے جن کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے ان نسوں کے جال کو حرام مغز کہتے ہیں۔ حرام مغز سے نسوں کی شاخیں سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں جنکی وجہ سے ہی جسم کے تمام اعضاء حرکت کرتے ہیں نسیں یا اعصاب تار برقی کی طرح کام کرتے ہیں۔ اور انہی کے ذریعہ دماغ جسم کے ہر حصہ میں حکم بھیجتا ہے۔ چٹانی کتابوں میں سب سے پہلا ریڑھ دار جانور مچھلی کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اور ان سے بھی پرانی چٹانوں میں ایسے جانداروں کے نشانات ملتے ہیں جن میں ریڑھ کی ہڈی نہیں تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مچھلی کسی ایسے ادنیٰ جانور سے نکلی ہے جس میں ریڑھ کی ہڈی نہیں تھی اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ جانور جن میں ریڑھ کی ہڈی نہیں تھی کس طرح ریڑھ دار جانوروں میں تبدیل ہو گئے۔

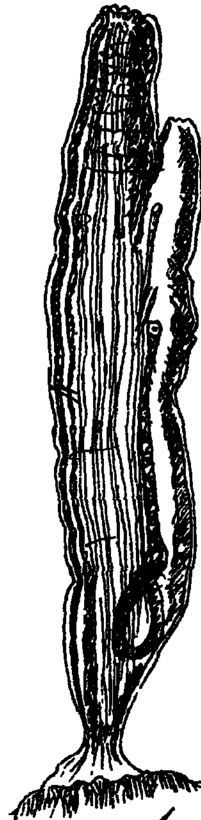
حیرت انگیز لینس لیٹ (Lancelet)

بہت عرصہ تک کوئی بھی اس گتھی کو سلجھا نہ سکا۔ بے ریڑھ کے اور ریڑھ دار جانوروں کے درمیان کی کڑی کے متعلق کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن کوشش و جستجو سے وہ کڑی بھی مل گئی۔ گرم اور معتدل ممالک میں سمندر کے

کنارے ریت میں ایک جانور رہتا ہے جسے لینس لیٹ کہتے ہیں۔ یہ جانور عام طور پر ایک سے دو انچ تک لمبا ہوتا ہے۔ اُس میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُس میں ہڈی ہوتی ہی نہیں۔ مگر ریڑھ کی ہڈی کی بجائے کُرّی (Cartilage or gristle) یعنی نرم ہڈی کی ایک ڈوری ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہوتی ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے پنسل میں سیسہ ہوتا ہے۔ لینس لیٹ کی یہ نرم ہڈی کی ڈوری ریڑھ کی ہڈی کی ابتدا ہے۔ کرّی کی ڈوری کو ریڑھ کی ہڈی کی ابتدا کیوں کہا جاتا ہے اس بات کو سمجھنے کے لئے آپ کو سی سکورٹ (Sea Squirt) سے بہت مدد ملے گی۔ یہ ایک چھوٹا سا جانور ہے جو سمندر کے کنارے چٹانوں سے چپکا ہوا پایا جاتا ہے۔ اس میں ریڑھ کی ہڈی بالکل نہیں ہوتی۔ مگر اس کے بچوں میں لینس لیٹ کی طرح کرّی کی ڈوری ہوتی ہے۔ جب یہ بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو کسی پہاڑی یا چٹان سے چپک جاتے ہیں۔ اور اُن کی کرّی کی ڈوری بھی غائب ہو جاتی ہے۔ (دیکھو نقشہ صفحہ ۱۱۲)

سی سکورٹ (Sea Squirt) کے بچے مینڈک کے بچوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اور اُنھیں دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ بڑے ہو کر مینڈک ہی کی قسم کے جانور بنیں گے۔ مندرجہ ذیل نقشہ میں دونوں کے بچوں کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ دونوں کے بڑے بڑے سر اور لمبی دُمیں ہیں۔ دونوں کی پشت میں نرم ہڈی یعنی کرّی کی ڈوری موجود ہے۔

(دیکھو نقشہ بر صفحہ ۱۱۳)



سی سکورٹ

اس جانور میں ریڑھ کی ہڈی بالکل نہیں ہوتی
اس کے باوجود اس کے بچوں میں مینڈک کے بچوں کی
طرح ریڑھ کی ہڈی سی ہوتی ہے جو بڑے
ہونے پر بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔

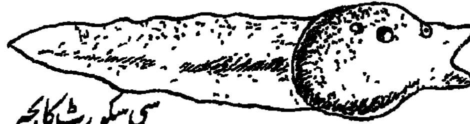


لینس لیٹ

یہ چھوٹا سا جاندار ریڑھ دار اور بے ریڑھ
کے جانداروں کے درمیان ایک کڑی ہے
یہ تصویر اس جانور کے اندرونی حصہ کی ہے۔ اس میں سیاہ
لکیر ریڑھ کی ہڈی کی ابتداء کو ظاہر کرتی ہے۔



مینڈک کا بچہ



سی سکورٹ کا بچہ

مینڈک اور سی سکورٹ دونوں کے بچے شروع میں بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن سی سکورٹ تو بے ریڑھ کے جانور کی شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے جبکہ مینڈک کے بچہ میں ریڑھ کی ہڈی بخوبی نشوونما پاتی ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ بے ریڑھ کے اور ریڑھ دار جانوروں میں بہت بڑا فرق نہیں ہے۔

سیپ دار مچھلی یا خولدار جانور Shell Fish

جب ہم چٹانی کتابوں میں اُن جانوروں کے نشانات کا مطالعہ کرتے ہیں جو مچھلیوں سے پہلے تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تقریباً تمام جانور خولدار تھے۔ اس قسم کے جانور کے چاروں طرف ایک ہڈی نما خول سا ہوتا ہے۔ مگر بذات خود یہ بالکل ملائم اور گوشت کا لوتھڑا ہی ہوتا ہے۔ اگر کسی خولدار جانور کا اس کے خول میں سے نکال کر خوردبین کے ذریعہ معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جانور مچھلی کی نسبت بہت ادنیٰ اور سادہ ہے اس کے مُنہ کھانے کے لئے۔ پیٹ ہضم کرنے کے لئے اور ایک دوسرا راستہ فضلہ خارج کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ یہ کچھ بھی نہیں چٹانی کتابوں کے خولدار جانور موجودہ زمانے کے خولدار جانوروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ جب ہم ان خولدار جانوروں کی دریا یا سمندر کے کنارے تلاش کرتے ہیں تو ہمیں ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے جاندار بھی ملتے ہیں جن کا چٹانی کتابوں میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر کیچوے کو لیں۔

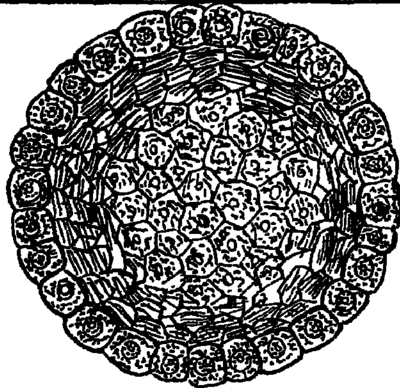
کیچوا اور کیچو مچھلی

کیچوے میں نہ کسی قسم کی سختی ہوتی ہے اور نہ ہڈی۔ مرجانے پر یہ بالکل مٹی ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چٹانی کتابوں میں کیچوے کی قسم کے جانوروں کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اس لئے کروڑوں برس پہلے کے کیچوے جیسے جانوروں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن سائنس اور علم الطبیعی کی رو سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مچھلیاں ضرور کسی کیچوے جیسے جانور

سے ہی نکلی ہیں۔ سمندر کے کنارے کی گیلی مٹی میں ایک قسم کا کیچوا ملتا ہے جسے گھنڈی دار کیچوا کہتے ہیں۔ اس میں مچھلی کی طرح گلپھڑے اور پنسل لیڈ جیسی نرم ہڈی کی ڈوری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جانور ایک طرح سے آدھی مچھلی اور آدھا کیچوا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے کیچو مچھلی بھی کہتے ہیں۔ گھنڈی دار کیچوے اور دوسرے کیچوؤں کی مدد سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس طرح کیچوا رفتہ رفتہ مچھلی میں تبدیل ہوا ہوگا۔ اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کیچوے جیسے جاندار کس سے نکلے ہیں ہمیں پھر موجودہ زمانہ کے جانداروں سے ہی مدد لینی پڑیگی۔ کیچوے کی شکل بالکل ایک لمبی سی نلکی کی مانند ہے۔ یہ منہ سے مٹی نگل لیتا ہے اور اس میں سے غذائی مادہ جذب کر لیتا ہے۔ مٹی چونکہ اس کے لئے بے کار چیز ہے اس لئے اس کو دوسری طرف سے خارج کر دیتا ہے۔

کیچوے کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت سے چھوٹی سی نما چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے جڑنے سے بنا ہے۔ اور ہر جوڑ پر جڑنے کا نشان بھی صاف نظر آتا ہے۔ بالفرض کیچوے کے جسم کے کسی ایک جوڑ کو علیحدہ کر کے اس کے دونوں سروں کو بند کر دیں تو یہ ٹکڑا کیچوے سے بھی زیادہ سادہ اس ادنیٰ جانور کی مانند ہو جائیگا جسے ہم گیند نما جانور کہتے ہیں۔ یہ جانور ایک ننھی سی گیند کی طرح ہے۔ اس میں ہضم کرنے کے لئے پیٹ تک بھی نہیں ہے۔ اس کا ہر حصہ خوراک نگلتا اور فضلہ پھینکتا ہے۔ یہ گیند نما جانور اتنا چھوٹا ہے کہ آتشی شیشہ کی مدد سے ہی بخوبی نظر آسکتا ہے۔ مگر اس جانور کو خوردبین کے ذریعہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کئی گاڑیوں اور انجن کے جڑنے سے ریل گاڑی بنتی ہے۔ اور ہر گاڑی میں بھی کئی حصے ہوتے ہیں اُسی طرح یہ ننھا سا جانور بھی ہزاروں ... چھوٹے چھوٹے زندہ جانداروں کے آپس میں جڑنے سے ہی بنا ہے۔ ۱۹

چھوٹے سے چھوٹے جانداروں کو ہم سیل Cell کہتے ہیں۔



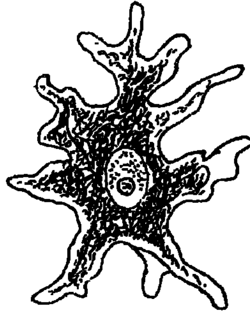
گیند نما جانور؛۔ یہ جانور سیلوں کی ایک گیند سی ہے۔ اسے یہاں پر بیچ میں سے کاٹ کر اور اُس کے اصل قد سے بہت بڑا کر کے دکھایا گیا ہے تاکہ سیلوں کی بناوٹ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

سیل۔ (کیسہ) (Cell)

سیل کے لفظی معنی کوٹھڑی کے ہیں۔ سیل کا خوردبین سے بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لعابدار زندہ مادہ Protoplasm سے بنا ہوا ہے۔ سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ ہر سیل بذات خود اکیلا زندہ رہ سکتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ خود ہی اپنی خوراک حاصل کرتا۔ ہضم کرتا اور فضلہ پھینکتا ہے۔ چنانچہ یہ گیند نما جاندار ان زندہ سیلوں کا صرف ایک مجموعہ ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ سیلوں کا مجموعہ گیند نما جانور سے اکیلا ایک زندہ سیل زیادہ

سادہ ہے۔ اگر ہم خوردبین Microscope کی مدد سے کسی جوہڑ کے پانی کو بغور دیکھیں تو ہمیں سینکڑوں زندہ سیل تیرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جو تنہا ہی زندگی کے تمام افعال پورے کرتے ہیں۔ ہم اس ایک سیل والے عجیب و غریب ننھے سے جاندار کی تصویر دیتے ہیں۔ اسے ہم ایمیبا Amaeba کہتے ہیں۔ یہ تصویر اس جاندار کے قد سے بہت بڑی کر کے دکھائی گئی ہے تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ ورنہ اس جانور کا قد اتنا چھوٹا ہے کہ یہ خوردبین کے بغیر نظر ہی نہیں آسکتا۔



ایمیبا

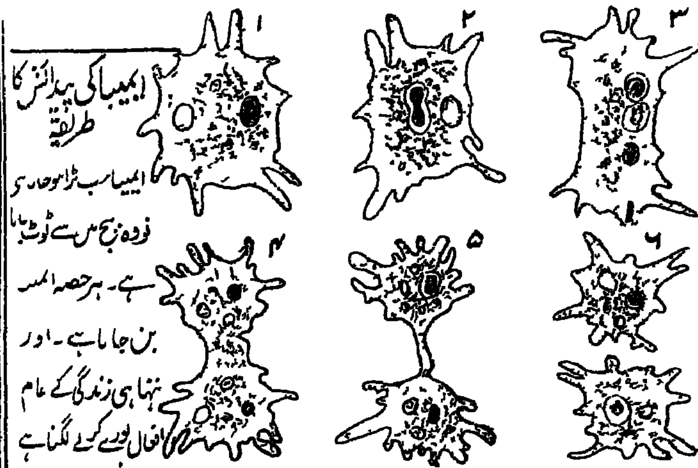
دُنیا کے سب سے سادہ اور ادنیٰ جانوروں میں سے ایک ؎

سب سے ادنیٰ جانور

ایمیبا کی تصویر دیکھ کر شاید آپ کہیں کہ اس کی تو کئی ٹانگیں ہیں۔ لیکن یہ ٹانگیں نہیں ہیں بلکہ اس کے جسم کے حصے ہیں جو یہ پانی میں آگے بڑھنے۔ یا خوراک کو پکڑنے کے لئے اِدھر اُدھر بڑھاتا رہتا ہے۔ ٹانگیں۔ ہاتھ۔ پیٹ وغیرہ سب اسی میں ہی ہیں۔ کیونکہ ایمیبا جسم کے ہر حصہ سے خوراک نگل سکتا

ہے۔ ضرورت کے مطابق جسم کے ہر حصہ کو ٹانگ کی صورت میں آگے بڑھا سکتا اور مختلف شکلیں بدل سکتا ہے۔ یہ جاندار جس کے اندر بیضوی شکل کا ایک نشان nucleus نظر آتا ہے صرف ایک سیل ہی ہے۔ اور یہ نشان ہی اس کی زندگی کا مرکز ہے۔ گیند نما جانور انہی سیلوں کے آپس میں جڑ جانے سے بنا ہوا ہے۔ ایمیبا دنیا کے سب سے ادنیٰ اور سادہ جانوروں میں سے ایک ہے۔ ایک سیل سے سیلوں کا مجموعہ بن جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ اور جب ہم ایمیبا کے بارے میں اور زیادہ جان جائیں گے تو ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

ایمیبا نہ پودوں کی طرح بیج دیتا ہے اور نہ مرغی کی طرح انڈے! برسوں خوردبین لئے ہوئے آپ ایمیبا کے بچوں کی تلاش کرتے رہیں تو بھی آپ انہیں کبھی دیکھ نہ سکیں گے۔ مگر تھوڑی سی محنت سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک ایمیبا سے دوسرا ایمیبا کیسے پیدا ہوتا ہے۔



ایمیبا کی پیدائش کا طریقہ

ایمیبا جب بڑا ہو جاتا ہے تو وہ بیچ میں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر حصہ ایمیبا بن جاتا ہے۔ اور تنہا ہی زندگی کے عام افعال پورے کرنے لگتا ہے

جب ایمیبا زیادہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس کا جسم درمیان میں سے پتلا ہوتا جاتا ہے۔ اور آخر کار ٹوٹ کر دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اب دونوں حصوں میں سے ہر حصہ ایک پورا ایمیبا ہے۔ ہر حصہ خوراک کھاتا ہضم کرتا اور بڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ یہ بھی زیادہ بڑا ہو کر اپنی باری میں دو حصوں میں ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے ایمیبا کی افزائش ہوتی ہے۔ ایک سے دو۔ دو سے چار۔ اور چار سے آٹھ ہوتے ہوتے کچھ ہی عرصہ میں ایک ایمیبا سے ہزاروں ایمیبا بن جاتے ہیں۔ یہی ایمیبا اگر دو حصوں میں علیحدہ ہونے کی بجائے آپس میں جُڑتے جائیں تو رفتہ رفتہ ایمیبوں کا ایک بنڈل بن جائے گا جسے ہم گیند نما جانور کہہ سکتے ہیں۔

انسان بھی سیلوں ہی کا مجموعہ ہے

اب آپ نے جب سیل کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لی ہیں تو ہم آپ کو اس کے متعلق چند باتیں اور بھی بتانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم انسانی جسم کے کسی حصّے کا چھوٹا سا ٹکڑا لیں اور اس کو خوردبین کے ذریعہ دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ ٹکڑا بھی لاکھوں سیلوں کے آپس میں جُڑنے سے بنا ہے۔ مگر جسم کی مختلف ساختوں کے سیل ایک دوسرے سے شکل اور بناوٹ میں فرق مختلف ہیں یعنی گوشت۔ پوست۔ ہڈی۔ اور بال وغیرہ کے سیل آپس میں نہیں ملتے لیکن وہ ہیں سب سیل ہی۔ اس لئے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ تمام انسان زندہ سیلوں کے بنے ہوئے پتلے ہی ہیں۔

ہر جانور کی بھی یہی صورت ہے ہر جانور بھی سیلوں کا ایک بنڈل ہے
ہر پودے کا بھی یہی حال ہے ہر پودہ بھی سیلوں کا ایک بنڈل ہے

اس سے ثابت ہوا کہ ہر جاندار محض سیلوں کا ایک مجموعہ ہے سیلوں کی مختلف بناوٹ اور ترکیب و ترتیب کی وجہ ہی سے یہ طرح طرح کی شکل و صورت نظر آتی ہیں۔

اب ہم اس سوال کا جواب کہ تمام جانداروں کا سب سے پہلا بزرگ کون تھا، دیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام جاندار سیلوں کا مجموعہ ہیں۔ دُنیا میں سیل ہی سب سے سادہ اور ادنیٰ جاندار ہے۔ یہ اکیلا سیل بڑھتے بڑھتے سیلوں کے مجموعہ والے جانور (مثلاً گیند نما جانور) میں تبدیل ہو گیا۔ سیلوں کا بنڈل رفتہ رفتہ مچھلی کی صورت میں بدل گیا۔ مچھلی دو عنصریوں میں۔ دو عنصری جانور رینگنے والوں میں۔ رینگنے والے دودھ پلانے والوں میں۔ دُودھ والے بے دُمے بندروں میں۔ بے دُمے بندر انسانی بندر میں۔ اور انسانی بندر انسان میں تبدیل ہو گیا۔ دوسرے الفاظ میں تمام جانداروں کی ابتدا ایک سیل سے ہوئی ہے۔ اور وہ سیل کہاں سے آیا؟ یہ وہ پہیلی ہے جس کا حل ابھی تک انسان دریافت نہیں کر سکا۔

مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ جانداروں کا آپس میں کتنا گہرا رشتہ ہے۔ پیڑ کا تنا ہوتا ہے۔ اُس تنے سے شاخ در شاخ پھوٹتی جاتی ہیں۔ اُن شاخوں میں سے پھول اور پتے نکلتے ہیں۔ یہی حال جانداروں کا بھی ہے۔ شروع میں ایک ہی قسم کے جاندار تھے۔ بعد میں افزائش نسل۔ حالات اور ضرورت کے مطابق اُن میں تبدیلیاں ہو کر طرح طرح کے جاندار بنتے گئے۔ جس طرح پتوں۔ پھولوں اور شاخوں کی زندگی کا ذریعہ درخت کا تنا اور جڑیں ہیں اُسی طرح تمام جانداروں کی زندگی کا سرچشمہ بھی ایک ہی ہے۔

دیکھو نقشہ شجرِ حیات صفحہ ۱۲۱

انسان

بن مانس

بندر

وہیل مچھلی

ہاتھی

کنگرو

دودھ پلانے والے جانور

چمگادڑ

معدوم شدہ شتر مرغ

دانت والے پرندے

پرندے

رینگنے والے جانور

بھیڑیے

مینڈک

زہردار بڑے مینڈک

دو عنصری جانور

ہڈی دار مچھلیاں

مچھلی

کیڑے مکوڑے

مکڑی

کنکھجورے

جوئیں

کیچوے

جوڑدار جانور

تمبو مچھلی

سی سکورٹ

آکٹوپس

گھونگے

سیپ دار کیڑے

سی ارچن

سٹار فش

سی للی

خاردار جانور

اینمون

جیلی فش

مونگا

کولن ٹریٹ

اسپنج

اس درخت کی جڑ سے شروع کرکے اوپر تک مطالعہ کریں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح زندگی ادنیٰ قسم کی شکلوں سے ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ صورتوں میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح ہم زندہ مادہ کے نقطہ نما نباتاتی

نباتاتی جانور

جانوروں سے شروع کرتے ہوئے زندگی کے درخت کی انتہا یعنی انسان تک پہنچ جاتے ہیں

پودوں کے متعلق دو باتیں

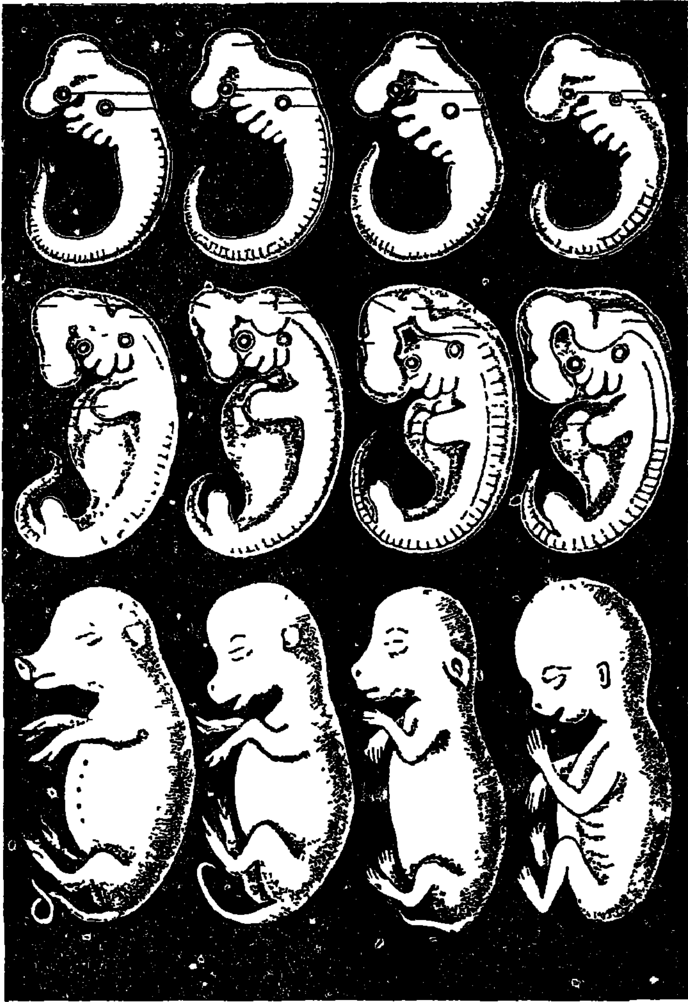
جانوروں ہی کی طرح پودوں کا بھی وکاس ہوا ہے۔ اتنا اشارہ کافی ہے کہ جس طرح ایک جانور سے کئی قسم کے جانور پیدا ہوئے ہیں اُسی طرح ایک پودے سے مختلف انواع واقسام کے پودے نکل آئے اگر اعلیٰ پودوں سے ادنیٰ پودوں کی طرف چلیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پودے بتدریج سادہ تر ہوتے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسے ادنیٰ پودے بھی موجود ہیں جو محض سیلوں کی جڑی ہوئی تاریں سی دکھائی دیتی ہیں۔ جو پانی میں تیرتی رہتی ہیں۔ اُن کی کوئی جڑ ہی نہیں۔ پانی جدھر چاہے بہا کرلے جاسکتا ہے۔ ان تار نما پودوں سے بھی اور ایسے ادنیٰ پودے ملتے ہیں جنھیں دیکھکر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نباتات ہیں۔ برسات کے زمانہ میں گیلی لکڑی پر سفید سفید رواں سا نظر آنے لگتا ہے۔ یہ رُوئیں باریک باریک جاندار ہیں جو پانی کے ایمیبا کی طرح بڑھتے ہیں۔ لیکن پودے کی شکل بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے انھیں نہ جانور کہا جاسکتا ہے اور نہ پودا۔ بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے زندہ نقطے سے ہوتے ہیں جو پودے اور جانور دونوں میں تبدیل ہوسکتے ہیں۔

ہم نے حتی الامکان قانونِ ارتقار کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اگر آپ کو پھر بھی یہ شک ہو کہ ایک چھوٹے سے سیل سے اتنے مختلف قسم کے جانور اور پودے کیسے ترقی کرسکتے ہیں تو برگد کے بیج اور مرغی کے انڈے کا مطالعہ کریں۔

برگد کا ننھا سا بیج جو ایک سیل ہے زمین میں دبا دیا جائے تو وہ سیل چند سالوں میں ہی اربوں سیلوں کا مجموعہ بن کر برگد جیسے عظیم الشان درخت

کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ مرغی کا انڈا مرغی ہی ہے۔ انڈے کو توڑ کر زردی کو بغور دیکھنے سے اس پر کسی جگہ ایک نہایت باریک سیاہ نشان نظر آئے گا۔ یہی وہ زندہ سیل ہے جو بڑھکر مرغی بن جاتا ہے۔ انڈے کی سفیدی اور زردی سب اس سیل کی خوراک ہیں جو انڈے کے اندر سیل کے بڑھنے اور پرورش پانے کے لئے قدرت نے مہیا کی ہے۔ مرغی انڈا دینے کے بعد جب اس پر بیٹھکر گرمی پہنچاتی ہے تو انڈے میں جو سیل ہے وہ ایمیبا کی طرح ایک سے دو اور دو سے چار ہو کر بڑھنے لگتا ہے۔ اور اپنی خوراک انڈے میں موجود غذا سے حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہ سیل ابتدا سے لے کر چوزہ بننے تک کئی درجات سے گذرتا ہے شروع میں اس ایک سیل سے کئی سیل بڑھ کر ایک تھیلی سی بن جاتے ہیں۔ تھیلی کے ایک سرے سے دماغ اور ریڑھ کی شروعات ہو جاتی ہے۔ اور درمیان میں پیٹ کے اعضا کا نظام بننے لگتا ہے۔ لیکن اس ابتدائی درجہ میں اس کے گلے کے پاس مچھلیوں جیسے گلپھڑوں کی درزیں دکھائی دیتی ہیں۔ مرغی کے بچے کے یہ گلپھڑے ہمیں اس بات کی یاددہانی کراتے ہیں کہ کبھی پرندوں کے آباواجداد بھی پانی میں رہنے والے اور گلپھڑوں سے سانس لینے والے جاندار تھے۔ اس کے بعد سیلوں کے متواتر بڑھتے جانے سے بچہ جب اور بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی شکل ہو بہو رینگنے والے جانوروں کے بچوں سے ملنے جلنے لگتی ہے۔ جب یہ تبدیلیاں ہو چکتی ہیں تو آخر کار وہ واحد سیل کروڑوں سیلوں کا مجموعہ بن کر چوزہ کی شکل میں انڈے سے باہر نکل آتا ہے۔ اسیطرح تمام انڈہ دینے والے جانوروں کے انڈوں میں بھی ایک سیل سے ہی بڑھکر بچہ بن جاتا ہے۔ یہی حال اُن جانوروں کا بھی ہے جو انڈے کی بجائے

بچہ دیتے ہیں۔ حمل میں ایک سیل سے بڑھتے بڑھتے اور کئی تبدیلیوں سے گذرتے ہوئے جب بچہ مکمل ہو جاتا ہے تو وہ پیدا ہوتا ہے۔ بندر اور دوسرے دودھ پلانے والے جانوروں کی حالتِ حمل میں جو جو تبدیلیاں شروع سے لے کر بچہ پیدا ہونے تک ہوتی ہیں بالکل ویسی ہی تبدیلیاں انسانی حمل میں بھی ہوتی ہیں۔ دوسرے جانداروں کی طرح انسانی حمل کی ابتدا بھی انچ کے ایکسو بیسویں حصہ کے قد کے سیل سے ہی ہوتی ہے یہی انسانی سیل ایک سے دو اور دو سے چار ہو کر انسانی بچہ بن جاتا ہے۔ انسانی حمل میں بھی ایک وقت میں بچہ کے تمام اعضا مچھلی سے ملنے لگتے ہیں گلے کے پاس گلپھڑے اور ان کی درزیں تک صاف نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد سلسلہ وار دو عنصری جانور amphibians رینگنے والے جانوروں اور پرندوں سے ملتی جلتی شکلوں سے گذر کر جنین (بچہ) نچلی ذات کے دودھ پلانے والے جانوروں کے جنین کے مشابہ ہوتا جاتا ہے۔ اور وضع حمل سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس میں انسانی امتیاز آتا ہے۔ اس درجہ میں بھی اس پر چند ایسے نشانات پائے جاتے ہیں جو انسان کے آبا و اجداد کی طرف اشارہ کرتے ہیں بچہ پیدا ہونے سے کچھ عرصہ پہلے اس کے تمام جسم پر بندر کی طرح بالوں کا رُواں ہوتا ہے۔ بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد ہی وہ بندر کی طرح کسی ڈنڈے کو اپنے پنجوں سے پکڑ کر لٹک سکتا ہے۔ انسان اور دوسرے جانوروں کے جنین شروع شروع میں ایک دوسرے سے از حد ملتے جلتے ہیں۔ اگر ابتدائی درجہ کے سب جانوروں کے جنین کو ایک جگہ رکھ دیا جائے تو تجربہ کار سے تجربہ کار علم جنین Embryologist کا ماہر مشکل سے یہ بتا سکے گا کہ انسان کا جنین کون سا ہے۔ اور مچھلی کا کون سا۔



سُؤر:۔ گائے خرگوش! ور انسان کے زمانہ حمل میں جنین کی مختلف شکلیں۔ دیکھیے
مختلف جانوروں کے یہ جنین آپس میں کتنے ملتے ہیں

صفحہ ۱۰۴ کے سامنے

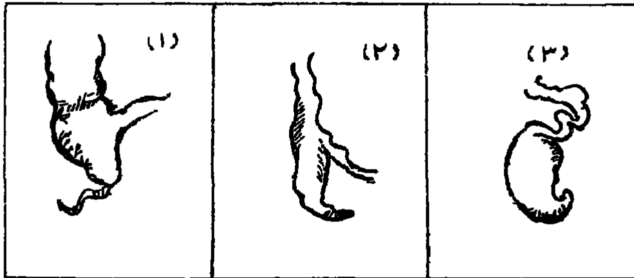
نشانی اعضاء Vestigial Organs

زندگی کی لڑائی میں جانداروں کو مختلف قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ (تنازع للبقاء) جانوروں کی جب کوئی نوع یا قسم اپنے موافق ماحول سے نکلکر نئے حالات کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو بہت ممکن ہے کہ اُن کے بعض اعضا ان نئے حالات میں کارآمد ثابت نہ ہوں اور ان کی ضرورت نہ رہے۔ اس کے برعکس شاید اُنھیں ایسے اعضا کی ضرورت پڑ جائے جو اُن کے پاس نہیں ہیں۔

گو یہ بات صحیح ہے کہ جاندار ضرورت کے مطابق غیر ضروری اعضا کو ایسے اعضا کی شکل میں بدل سکتے ہیں جن کی اُنھیں نئے حالات میں ضرورت ہو۔ لیکن عام قدرتی اصول یہ ہے کہ جسم کے جن اعضا کا استعمال نہیں ہوتا وہ رفتہ رفتہ ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ بے کار اعضا میں قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ اور اگر وہ لگاتار بے کار ہی رہیں تو وہ نہ صرف ضعیف اور کمزور ہی ہو جاتے ہیں بلکہ کئی پشتوں کے بعد بالکل ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ اس چیز کی لاتعداد مثالیں ہیں۔ سانپ کے جسم سے ٹانگوں کا معدوم ہو جانا اس کی ایک مثال ہے۔ اس کے برعکس کسی عضو سے متواتر کام لیا جائے تو وہ رفتہ رفتہ مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اور کئی پشتوں کے بعد تو اس کا اثر نمایاں طور پر نظر آنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر اُن گایوں کے تھن بہت بڑھ جاتے ہیں جن کا دودھ دوہا جاتا ہے۔ اور وہ گائیں جن کا دودھ نہیں دوہا جاتا اُن کے تھن چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ جانوروں میں سینکڑوں ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں بے کار اعضا ابھی تک سُکڑی اور کمزور حالت میں موجود ہیں۔ یہی اعضا ان موجودہ جانوروں کے بزرگوں میں بخوبی نمایاں اور مضبوط تھے

جن سے کہ وہ کام لیتے تھے۔ مگر حالات کے بدل جانے کے باعث وہ اعضا اب اُن کے لئے محض بے کار ہیں۔ اس لئے رفتہ رفتہ اُن کے جسم سے معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے اعضا کو ہم نشانی اعضا (Vestigial-Organs) کہتے ہیں۔

نشانی عضو کی سب سے عمدہ مثال انسان میں زائیدہ (appen-dix) کا موجود ہونا ہے۔ دودھ پلانے والے جانوروں کے اعضا بر انہضام کو شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو اُن میں مری۔ معدہ۔ آنتیں وغیرہ کئی الگ الگ حصے نظر آئیں گے آنتوں کے دو حصے ہیں۔ چھوٹی آنتیں۔ اور بڑی آنتیں۔ جہاں چھوٹی آنتیں ختم ہو کر بڑی آنتیں شروع ہوتی ہیں وہاں ایکطرف بند منہ والی ایک تھیلی سی لگی ہوئی ہے جسے زائیدہ (appendix) کہتے ہیں۔ انسانی جسم کا یہ وہ بے کار عضو ہے جسے ورم زائدہ (appen-dicitis) کی حالت میں آپریشن کر کے نکال دیا جاتا ہے۔



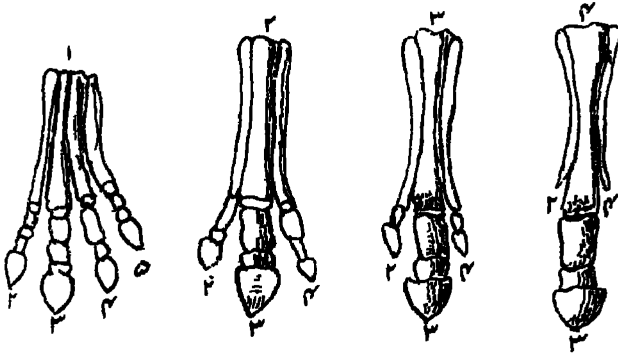
(۱) انسان۔ (۲) بندر۔ اور (۳) چوہے میں زائیدہ کی تشکیل ؛

انسان کو چھوڑ کر دوسرے دودھ پلانے والے جانوروں کے لئے یہ عضو نہایت ہی کار آمد ہے۔ معدہ کی طرح اس میں بھی کھانا ہضم اور جذب ہوتا ہے۔ چوہے میں یہ زائیدہ معدہ کے برابر ہی بڑا ہے۔ لیکن انسان کے جسم میں اس کی بہت کمزور حالت ہے (ممکن ہے کہ انسان کے دو پاؤں کے بل کھڑا ہونے کی وجہ سے اس پر ایسا اثر پڑا ہو) بیماری پیدا کرنے کے سوا اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ نہ ہی یہ غذا کے ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ بیر یا اسی قسم کے کسی اور پھل کی گٹھلی اگر اچانک نگل لی جائے تو بعض اوقات گٹھلی کا اس تھیلی میں اٹک جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو اس جگہ سوزش اور ورم ہو کر اکثر انسان مر جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ عضو انسان میں سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح سانپ کی ٹانگیں اور پرندوں کے بازوؤں پر سے پنجے ختم ہو گئے۔

بہت سے دودھ پلانے والے جانوروں کے پاؤں پر نشانی انگلیاں پائی جاتی ہیں۔ گائے کے ہر پاؤں پر دو انگلیاں ایسی ہیں جن کا کوئی کام نہیں یہ انگلیاں گائے کے کھُر کی پچھلی طرف دیکھی جا سکتی ہیں بھیڑ۔ بکری۔ سور اور ہرن میں بھی اسی طرح دو۔ دو نشانی انگلیاں ہر پنجہ پر موجود ہیں۔ کتے کے اگلے دونوں پاؤں پر بھی ایک ایک نشانی انگلی موجود ہے جو کبھی زمین پر نہیں ٹکتی۔ ابتدائی دودھ پلانے والے جانوروں کے (جن سے موجودہ تمام نسلیں نکلی ہیں) ہر پنجہ میں پانچ پانچ انگلیاں تھیں۔ بعض دودھ پلانے والے جانوروں میں اب تک انہی کی طرح پانچ پانچ انگلیاں پائی جاتی ہیں۔ بندر اور ہاتھی اسکی


گائے کی وہ نشانی انگلیاں جو بیکار ہیں

مثالیں ہیں۔ مگر زیادہ تر ان میں بعض کی ایک اور بعض کی اس سے زیادہ انگلیاں ہر پنجہ میں سے کم ہوگئی ہیں۔ گائے کی قسم کے جانوروں میں تین انگلیاں کم ہوگئی ہیں اور دو باقی بچی ہیں۔ گھوڑے میں چار کم ہوگئی ہیں۔ اور صرف ایک ہی بچ رہی ہے۔ لیکن ان تمام جانوروں میں غائب شدہ انگلیوں کے نشانات ابھی تک موجود ہیں۔



گھوڑے کی نشانی انگلیاں:- لاتعداد عرصہ میں پانچ انگلیوں والے لومڑی جتنے گھوڑے کے پاؤں کے ارتقار کی داستان۔ اب صرف گھوڑے کے سُم کے علاوہ دو انگلیاں نشانی حالت میں موجود ہیں۔ دیکھو نمبر ۴

انسان اور دوسرے اعلیٰ طبقے کے جانوروں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ انسان کے جسم پر بہت کم بال ہوتے ہیں۔ مگر جسم کے زیادہ تر حصہ پر بالوں کا باریک باریک رُواں ضرور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض آدمیوں کے جسم پر زیادہ بال ہوتے ہیں۔ ایسے بھی آدمی دیکھنے میں آئے ہیں جن کے

تمام جسم پر گھنے بال ہوتے ہیں کئی خاندان ایسے ہیں کہ جن میں مردوں کی برؤں کے بال چمپانزی کی بھوؤں کے بالوں کی مانند بڑے لمبے ہوتے ہیں بعض کے کندھوں پر تو بعض کے کانوں پر لمبے لمبے بال نکل آتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے تمام جسم پر بندروں کی طرح لمبے لمبے بال ہوتے ہیں۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ انسانی جسم کے یہ بال اس بات کا نشان ہیں کہ کبھی انسان کے آبا و اجداد کے جسم بھی دوسرے جانوروں کی طرح بالکل بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

بچہ کے پیدا ہوتے ہی اگر اُسکے ہاتھ میں کوئی پتلا سا ڈنڈا تھما دیا جائے تو بچہ اس کو ایسی مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے کہ اُس سے لٹک کر وہ اپنے سارے جسم کا بوجھ کچھ منٹوں تک سنبھال سکتا ہے۔ بندریا کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنی ماں کے پیٹ سے لٹکتے ہوئے جس نے دیکھا ہوگا وہ انسانی بچہ میں اس قسم کی طاقت کو دیکھکر ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ انسان کے آبا و اجداد بندر جیسے جاندار ہی تھے۔ درختوں پر رہنے والے جانداروں کے بچوں میں ایسی طاقت نہ ہو تو اُن کا گذارہ ہونا نہایت مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن ہے۔ بندروں سے وکاس پاکر انسان کے درجہ کو پہنچے ہوئے جانداروں کے ہاتھوں کے پٹھوں میں اس قسم کی قوت غیر ضروری ہے اس لئے یہ پٹھے رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ پٹھے پیدا ہونے کے بعد آہستہ آہستہ کمزور ہونے لگتے ہیں۔ اور جب بچہ دو برس کا ہو جاتا ہے تو یہ پٹھے اتنے کمزور ہو جاتے ہیں کہ جو بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے جسم کا تمام وزن ڈنڈے کو پکڑ کر کچھ منٹ تک لٹک سکتا تھا وہی دو برس کے بعد کچھ سیکنڈوں تک بھی نہیں لٹک سکتا

عقل داڑھ | انسانی جبڑے میں سب سے آخر کی داڑھیں عقل داڑھ

کے نام سے مشہور ہیں۔ اس سلسلہ میں انسان کا بے دُمے بندروں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی یہ داڑھیں بہت گری ہوئی حالت میں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان داڑھوں سے انسان نے صدیوں سے کوئی کام نہیں لیا۔ کیونکہ بندر اور بن مانس کی طرح انسان کچے سخت پھل اور جڑیں وغیرہ نہیں کھاتا نیز آگ پر پکائی ہوئی غذا کو چبانے کے لئے ان داڑھوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گوریلا کی یہ داڑھیں بہت مضبوط اور نوکیلی ہوتی ہیں۔ اور دوسری داڑھوں کے ساتھ ہی نکل آتی ہیں۔ وحشیوں میں یہ بچپن کے آخر میں نکلتی ہیں۔ لیکن تہذیب یافتہ قوموں میں یہ جوانی میں ہی نکلتی ہیں۔ کئی آدمی ایسے بھی ہیں جن کی یہ داڑھیں بالکل نکلتی ہی نہیں چنانچہ یہ داڑھیں بھی انسان میں اب نشانی حالت میں ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ نکلنا ہی بند ہو جائیں گی۔

دُمدار آدمی

کبھی کبھی ایسے بچے پیدا ہوتے ہیں جن کی دُم ہوتی ہے۔ یونان کے ایک مشہور ڈاکٹر سرجن جنرل برنرڈ آرن سٹائین (Surgeon General - Bernard Ornstein) نے اس مضمون پر ایک باتصویر کتاب شائع کی ہے۔ جس میں سے چند تصاویر ہم یہاں دیتے ہیں۔ دُمدار جانوروں کے جسم کی بناوٹ کا معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ریڑھ کی ہڈی کے آخری گُریئے سے دُم شروع ہوتی ہے اس آخری گُریئے کا نام ڈُھڈّی کی ہڈی (Oscoccyx) ہے۔ اگر انسان خاص طریقے سے پیدا ہوتا یعنی ادنیٰ جانوروں سے اس کا ارتقاء نہ ہوا ہوتا تو انسان کی ریڑھ کی ہڈی میں ڈھڈّی کی ہڈی کی موجودگی



دُمدار انسان

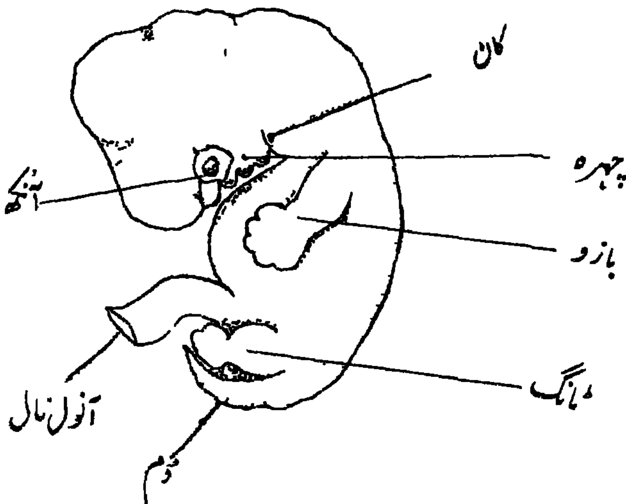
تصویر متعلقہ مضمون صفحہ ۱۳۰



اس تصویر سے آپ کو کچھ اندازہ ہوگا کہ اس وقت جبکہ انسانی بندر انسانی شکل میں تبدیل ہو رہے تھے تو انکی شکل و صورت کیسی تھی، یہ تصویر انسانی بندروں کے فاسلز کو دیکھکر بنائی گئی ہے

تصویر متعلقہ مضمون صفحہ ۹۱

نہ ہونا چاہیئے تھی۔ لیکن انسان کی ریڑھ کی ہڈی کے آخر میں بھی یہ ہڈی موجود ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دُم کو ہلانے والے پٹھے بھی اس ہڈی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس ہڈی اور پٹھوں کو دیکھ کر ہمیں نڈر ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ دُم والے جانداروں سے ہی انسان کا وکاس ہوا ہے۔ اگرچہ انسان میں جسم سے باہر نکلی ہوئی دُم موجود نہیں ہے تب بھی جسم کے اندر دُم کی نشانی ہڈی Vestigial Bone مع دُم ہلانے والے پٹھوں کے اب بھی موجود ہے۔



انسانی دُم:۔ انسانی جنین میں ڈھڈی کی ہڈی کی صورت۔ انسانی دُم کا فقط یہی حصہ اب نشانی عضو کی شکل میں موجود ہے۔

مذاہب کی ابتدا

پچھلے ابواب کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ دُنیا اور انسان کا ظہور عقل کل کے قانون ارتقار کے مطابق ہی ہوا ہے۔ اسی طرح انسانی نسل کی ابتدا سے لے کر اب تک کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی کے ہر پہلو میں رفتہ رفتہ ہی ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے موجودہ حالت تک ترقی کی ہے۔ وہ کبھی غاروں میں رہتا تھا۔ پھر اس نے گھانس پھونس کی جھونپڑیاں بنانا سیکھیں۔ ان ادنی حالات سے ترقی کرتے کرتے آج وہ دن ہے کہ اُسے ستر ستر منزلہ عالی شان محل تعمیر کرنے کا فخر حاصل ہے۔ انسان کی سب سے پہلی پوشاک گھاس۔ پتے اور کھالیں تھیں۔ اور اُس پوشاک سے ترقی کرتے ہوئے۔ ململ۔ پشمینہ۔ اطلس جیسے کپڑوں کا وکاس ہوا ہے۔ ابتدا میں انسان پھل۔ پھول اور کچا گوشت ہی کھاتا تھا۔ کیونکہ وہ آگ کا استعمال نہیں جانتا تھا۔ انسانی ترقی کی تاریخ میں آگ کا استعمال بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ انسانی تہذیب و تمدن کا انحصار بڑی حد تک آگ کے استعمال پر ہی ہے۔

اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں انسان نے ابتدائی ادنی حالات سے ہی ترقی کی ہے۔ آج ہم شروع زمانہ کے وحشیوں اور موجودہ انسان کے طرز رہائش۔ طریقہ بار برداری۔ جملہ فنون امن و جنگ۔ غرضکہ ہر چیز میں زمین و آسمان کا فرق دیکھتے ہیں۔ دیگر تمام باتوں کی طرح ہماری زبان بھی نہایت

ہی ادنیٰ صورت سے موجودہ حالت تک پہنچی ہے۔ زبان کی تاریخ سے یہ بات ظاہر ہے کہ ہر ملک و قوم کی زبان زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ اور نئی نئی صورتیں بھی اختیار کرتی رہی ہے۔ صرف حروفِ تہجی بنانے میں انسان کو ہزاروں برس کا عرصہ لگ گیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا انسان سے تعلق ہے خواہ وہ تہذیب ہو یا تمدن۔ زبان ہو یا مذہب سب ابتدائی ادنیٰ حالات سے ہی ترقی کر کے موجودہ کمال کو پہنچے ہیں۔ یہاں پر بعض دوست کہیں گے کہ کیا مذہب بھی دوسری چیزوں کی طرح ترقی کر سکتا ہے؟ مذہب تو ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب نے بھی ابتدائی ادنیٰ مذہب سے ہی ترقی کی ہے مذہب کو برباد کر دیتا ہے۔ لیکن ہمیں سوچنا ہے کہ اگر مذہب بھی قانون ارتقاء کے مطابق ادنیٰ حالات سے ترقی کرتا ہے تو کیا اُسے کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے؟ اگر ہم یہ کہیں کہ انسان کی ذہنی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اور حالات کے مطابق ہی مذہب نے ترقی کی ہے تو اس صورت میں ہم عقلِ کُل کے قوانین کی جو تمام کائنات میں یکساں جاری و ساری ہیں مطابقت کرتے ہیں۔

مذہب دُنیا میں یا تو طبعی طور پر قانونِ ارتقاء کے مطابق ہی بڑھا ہوگا۔ جیسا کہ تمام علوم و فنون۔ زبان اور تہذیب حتیٰ کہ خود انسان کا ظہور ہوا ہے یا پھر یہ کسی زمانہ میں معجزے کی صورت میں یا کسی غیر قدرتی طریقہ پر یکلخت پیدا ہو گیا ہوگا۔ بالفرض مذہب معجزے کی صورت میں انسان پر نازل ہوا تھا۔ ایسی صورت میں ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ اور کس پر ہوا تھا؟ بعض تو اس کا جواب ویدوں کی صورت میں دیں گے۔ ویدوں کی قدامت اور شاستروں کی شہادت اس کا ثبوت ہوں گے۔ کسی عیسائی سے پوچھو تو وہ انجیل کی طرف

اشارہ کردیگا۔ اور اُسی عقیدت سے ایک پارسی زوراشٹر کی تحریروں کو ہی مذہب کی بنیاد قرار دے گا۔ اور اگر کسی مسلمان سے دریافت کرو تو وہ کمال عقیدت سے قرآن ہی کو مذہب کا سرچشمہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا مگر ان سب کے دعووں سے کہ اُن کی کتاب ہی مذہب کا سرچشمہ ہے ہمیں پورا پورا اختلاف ہے۔ ہر دعویدار اپنی کتاب کو ہی سچا بتاتا ہے۔ اور اس کے علاوہ تمام کتابوں کو غلط ٹھیراتا ہے۔

اگر ہم تعصب کو چھوڑ کر اس مسئلہ پر تھوڑا سا بھی غور کریں تو معلوم ہو جائیگا کہ مذہب کی ابتدا کسی کتاب سے نہیں ہو سکتی۔ کتاب خیالات کو ضرور محفوظ رکھ سکتی ہے مگر اُن کو پیدا نہیں کر سکتی۔ کسی بھی مذہب کی کتاب بہت پُرانی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ انسان کی قدامت کو نہیں پہنچتی۔ ظاہر ہے کہ مذہب پُرانی سے پُرانی کتاب سے بھی پہلے موجود تھا۔ اصل میں مذہب انسان کی ذہنی کیفیتوں کا عکس ہے۔ جیسے جیسے ان کی ذہنی ترقی ہوتی گئی مذہب بھی ادنیٰ سے اعلیٰ ہوتا گیا۔ انسان کے ذہن پر عجائبات قدرت کے اثر ہی کا نتیجہ ہے۔ کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی بہت بڑی طاقت ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں وہ اپنی مرضی سے نہیں آیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بغیر مدد کے اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ کوئی نہ کوئی قوت ہے جو اس کی مالک ہے۔ اس لئے ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ جب ہم ایک وحشی سے وحشی کو بھی خوف اور ہیبت سے پرستش کے طور پر سر جھکاتے دیکھتے ہیں۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ کسی درخت یا پتھر کی ہی پوجا کر رہا ہو۔ یہ پتھر ہی اُس کے بچوں جیسے خیالات میں ایک زبردست طاقت کے نشان کا درجہ رکھتا ہے۔ وحشی اور نیم وحشی لوگوں کا مذہب لازمی طور پر ادنیٰ اور توہمات سے پُر ہوتا ہے۔ لیکن انسانی

ترقی کے ساتھ ساتھ مذہب بھی ترقی کرتا ہے۔ وہ جیسے جیسے عقل کل کی حقیقت کو سمجھتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کا مذہب بھی اعلیٰ اور ارفع ہوتا جاتا ہے۔

مذہب کی عجیب باتیں

تاریخ عالم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں اور سلطنتوں کے عروج وزوال کے ساتھ نئے نئے مذاہب بھی پیدا اور ختم ہوتے رہے ہیں قدیم مصریوں کی حکومت کے ساتھ ان کا مذہب بھی اب محض عہد ماضی کی یادگار رہ گیا ہے۔ بابلی۔ دراوڑی اور دوسرے قدیم مذاہب کی جگہ نئے نئے مذہبوں نے لے لی ہے۔ اس وقت بھی طرح طرح کے مذاہب پھیلے ہوئے ہیں۔ عیسائیت۔ اسلام۔ بدھ ازم۔ کنفیوشس اور ہندو دھرم کے دنیا میں سب سے زیادہ پیرو نظر آتے ہیں۔ ہم نے صرف چند مشہور مذاہب ہی کے نام لئے ہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مذاہب اتنی تعداد میں ہیں کہ تمام عمر بھی ان کے مطالعہ میں صَرف کردی جائے تو بھی سب پر عبور حاصل نہیں ہوسکتا کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ یہ سب مذاہب کہاں سے آئے؟

شاید آپ کو یہ مضمون کچھ خشک سا معلوم ہو رہا ہو۔ مگر مذہب کی یہ کہانی ازحد دلچسپ ہے۔ اس میں بہت سی عجیب وغریب باتوں کا ذکر ہے۔ جیسے نیوزی لینڈ کے باشندے پتھر کے دیوتاؤں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اُن کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی کو کھینچتے ہیں۔ بعض حصّے نہایت ہی خوفناک اور دردانگیز بھی ہیں۔ مثلاً مذہبی تہواروں پر انسانی قربانی۔ سپین کے پادریوں کا کافروں کو شکنجوں میں کس کر جسم کے جوڑ جوڑ کو

توڑ کر ٹکڑے کر مارنا۔ اُن خوفناک اور خونی لڑائیوں کا بیان جو خدا اور مذہب کے نام پر ہوئیں۔

اب ہم یہ بتائیں گے کہ مذہب کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ کیسے بڑھتا ہے اور پھر کیوں ختم ہو جاتا ہے۔ مذہب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بچے کی طرح پیدا ہو کر بڑھتا ہے کچھ تعجب انگیز ہو۔ جیسے عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ تمام پودے اور جانور ہمیشہ ایسے ہی چلے آئے ہیں اور وہ کبھی بدلتے نہیں اسی طرح مذہب کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جیسی حالت میں ہی ہمیشہ سے قائم آتا ہے۔ لیکن ہم واضح طور پر سمجھا چکے ہیں کہ پودے اور جانور سب آہستہ آہستہ بدلتے رہتے ہیں۔ اور سب کے سب ایک ادنیٰ اور چھوٹے جاندار سے پیدا ہوئے ہیں۔ مذہب بھی اسی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ تمام مذاہب بھی ایک ادنیٰ قسم کے مذہب سے ہی نکلے ہیں۔

سب سے پہلا مذہب کیا تھا؟

آج سے تقریباً چالیس ہزار ۴۰۰۰۰ برس پہلے جبکہ انسان کو انسانی بندر سے ترقی کئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا، اس نے پتھر کے ہتھیار بنانا ابھی سیکھا ہی تھا۔ غاروں میں ننگے رہنا اور جانوروں کا شکار کرنا اس کا شیوہ تھا تو اس وقت اس کی دماغی قابلیت اور تجربہ بھی ابتدائی حالت میں ہی تھا۔ اُن میں سے عقلمند سے عقلمند آدمی بھی اس کے سوا کچھ نہ جانتا تھا کہ وہ دوسروں کی نسبت اچھے پتھر کے ہتھیار بنا لے یا شکار کھوجنے میں زیادہ چالاکی سے کام لے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے اردگرد قدرت کے سب کام کیسے ہوتے ہیں۔ انھیں پتہ نہ تھا کہ سورج مشرق سے کیوں نکلتا

ہے اور پھر مغرب میں کیوں ڈوب جاتا ہے۔ چاند کا گھٹنا بڑھنا اُن کے لئے
ایک معمہ تھا۔ بیماری اور موت کو تو وہ سمجھ ہی کیا سکتے تھے۔ ایسی باتوں کے متعلق
وہ صرف قیاس سے ہی کام لیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان قیاسات کے مجموعہ نے
مذہب کا رنگ اختیار کر لیا۔ آپ تعجب کریں گے کہ ہم ہزاروں برس پہلے کے
انسانوں کے خیالات کو کیسے جان سکتے ہیں جب کہ وہ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ
پڑھنا۔ مگر جس طرح ہمیں ایک ننھا سا ایمیبا کروڑوں برس پہلے کے جانداروں کو
سمجھنے میں مدد دیتا ہے اسی طرح اُن قدیم بزرگوں کے چھوڑے ہوئے نشانات
سے ہمیں اُن کے خیالات کا اندازہ کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اُن غاروں
کی دیواروں پر جن میں وہ رہتے تھے اکثر کھدے ہوئے نقوش اور تصاویر ملتی
ہیں جو ان کی ذہنی کیفیات کی آئینہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ زمانہ کے جنگلی
بھی اُن قدیم لوگوں کی طرح ہی ہیں اس لئے اُن کے مذاہب کا مطالعہ کرنے
سے ہمیں ابتدائی انسانوں کے مذاہب کا ایک نمونہ سا مل جاتا ہے۔ یہ تو سب
جانتے ہی ہیں کہ وحشی بہت ہی جاہل اور مورکھ ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ جاہل اور
بے خبر ہیں اس لئے ہر اُس چیز سے ڈرنے لگتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے۔ کل ہی
کی تو بات ہے کہ لوگ آسمان میں دُم دار تارے کے نظر آجانے سے ہی ڈر جاتے
تھے۔ یہ چیز اس وقت تک خوف کا باعث رہی جب تک کہ لوگوں کو یہ معلوم نہ
ہو گیا کہ یہ چمکتے ہوئے مادہ کا صرف ایک بادل ہے جو آسمان میں پھرتا ہوا کبھی
زمین کے سامنے بھی آجاتا ہے۔ اسی طرح سورج یا چاند گرہن کے موقعہ پر
لوگ گھبرا جاتے تھے۔ مگر جب یہ معلوم ہو گیا کہ سورج گرہن چاند کے سورج کے
سامنے آجانے سے اور چاند گرہن زمین کا چاند پر عکس پڑنے سے ہوتا ہے تو
لوگوں کا اس چیز سے ڈر جاتا رہا۔

ایک سیاح اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ اُس نے جنگلیوں کو اپنے مُنہ سے مصنوعی دانت نکال کر ڈرا دیا۔ وہ وحشی مصنوعی دانتوں سے ناواقف تھے اس لئے انھوں نے سوچا کہ جو شخص اپنے دانتوں کو جب چاہے مُنہ میں سے نکال لے اور دوبارہ لگا لے ضرور کوئی بڑا جادوگر ہوگا۔

وحشی ہر چیز کو اس کی ظاہری حالت سے ہی جانچتا ہے۔ وہ کسی چیز کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اُس کی سمجھ ایک بچہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اُسے سُورج نکلتا اور ڈوبتا نظر آتا ہے اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ سورج ہی ہے جو گھومتا ہے۔ وہ ہوا کو ایک زندہ چیز سمجھتا ہے۔ ہوا کے چلنے سے جو شائیں شائیں ہوتی ہے وحشی کے خیال میں یہ ہوا کی آواز ہے۔ اپنی لاعلمی کے باعث وہ ہر غیر معمولی چیز سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ دُنیا کی ہر وہ چیز جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی اُس کے لئے خوف کا موجب ہوتی ہے۔

جہالت سے ہی خوف پیدا ہوتا ہے

پتھر کے زمانہ کے انسانوں کی زندگی کا خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں بھی ڈرانے کے لئے بہت سی چیزیں تھیں۔ رات کا بھیانک اندھیرا اُن کے لئے ضرور دہشت کا سبب ہوتا ہوگا۔ سُنسان رات میں خوفناک درندوں کا دھاڑنا۔ ہوا کا درختوں سے ٹکرانا اور سائیں سائیں کی آواز۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اُنھیں ضرور خوفزدہ اور پریشان کر دیتی ہوگی بارش اور طوفان کے جھونکے جب اُن کی کمزور جھونپڑیوں کو گرا دیتے ہوں گے یا ان کے رہنے کے غاروں میں پانی بھر جاتا ہوگا تو انھیں ایسا معلوم ہوتا ہوگا گویا یہ زبردست طاقتیں انھیں نیست و نابود کر دینے کی کوشش کر رہی

ہیں۔ وہ چھپی ہوئی طاقت جو بیمار کر دیتی ہے اُنھیں اور بھی زیادہ خوفناک معلوم ہوتی ہوگی۔ حتیٰ کہ آبشار کا شور اور پہاڑوں کی گونج جیسی بے ضرر چیزیں بھی اُن کو ڈرا دیتی ہوں گی۔

موجودہ زمانہ کے وحشیوں کی طرح ابتدائی انسان بھی جاہل اور نادان تھے اس لئے وہ بھی ان ہی کی طرح وہمی اور ڈرپوک تھے۔

ابتدائی انسان بھی بے علمی اور خوف کی حالت میں ہی قدرتی مظاہر کے بارے میں سوال و جواب کیا کرتے ہوں گے۔ وہ اپنی زندگی کے متعلق بھی ضرور سوچتے ہوں گے کہ وہ کیوں آئے اور کہاں سے آئے؟ اُن لوگوں کو سب سے زیادہ حیرانی زندگی کے ختم ہو جانے سے ہوتی ہوگی۔ آدمی کے مرجانے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ جسم تو پہلے ہی کی طرح موجود ہے لیکن اس نے سانس لینا اور ہلنا جلنا بند کر دیا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو زندہ اور مردہ میں فرق ظاہر کرتی ہے؟ ایسے ایسے سوالات ہی اُنھیں پریشان کرتے ہوں گے۔

پتھر کے زمانہ کے کسی وحشی کا خیال کریں جو اپنے ساتھی کی نعش کے پاس بیٹھا ہوا اُسے پکار رہا ہے۔ اُس کا کندھا پکڑ کر ہلاتا ہے۔ اس کے جسم کو بار بار چھوتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کے بار بار پکارنے پر بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔ وہ حیران ہے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ رفتہ رفتہ رات ہو جاتی ہے۔ اور وہ نیند سے مغلوب ہو کر سو جاتا ہے۔ اس کا پتھر کا کلہاڑا اس کی بغل میں رکھا ہوا ہے۔ وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کا مردہ ساتھی زندہ ہو گیا ہے۔ اور دونوں شکار کھیلنے جا رہے ہیں۔ کسی جانور کو مار لیا ہے اور اُسے کھا رہے ہیں یا دونوں مل کر دشمنوں سے پتھر کے کلہاڑوں سے لڑ رہے ہیں۔ مگر جب دن نکلنے پر وہ بیدار ہوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا

ساتھی اُسی طرح بے جان پڑا ہوا ہے۔ ہمارا یہ بزرگ جس طرح موت کی حقیقت کو نہیں سمجھتا ویسے ہی وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ سپنے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ان گتھیوں کو اپنے سادہ طریقے سے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ سو جانے پر بھی وہ خواب کی دُنیا میں اُسی طرح لڑتا اور شکار کھیلتا ہے جیسے کہ وہ ہوش کی دُنیا میں کیا کرتا ہے۔ خواب کی دُنیا میں وہ اُن لوگوں سے بھی ملاقات کر لیتا ہے جو مر چکے ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ وہ یہ نکالتا ہے کہ انسان میں ایسی کوئی چیز ضرور ہے جو سو جانے کے بعد جسم سے نکل جاتی ہے۔ اور جاگنے سے فوراً پہلے واپس آجاتی ہے۔ یہی چیز مر جانے کے بعد جسم کو بالکل چھوڑ دیتی ہے۔ اور پھر وہ صرف خواب کی دُنیا میں ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں ہم ابتدا میں ہی دیکھتے ہیں کہ اس وقت ایسی روح کا خیال موجود تھا جو مر جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔

وحشی اور رُوحیں

تمام جنگلی اقوام میں روحوں اور بھوتوں کے متعلق نہایت پختہ اعتقاد موجود ہے۔ جب وحشی پانی میں اپنے عکس پر نظر ڈالتا ہے اُسے اپنا ہمزاد نظر آتا ہے۔ اپنے سایہ کو پیچھا کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو بھی وہ یہی سمجھتا ہے (فجی کے باشندے تو سایہ کو کالی رُوح کہتے ہیں) جب وہ پہاڑوں میں گونج یا صدائے بازگشت سُنتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ کوئی رُوح اُس کے الفاظ کو دُہرا رہی ہے۔ وہ سوتے کو جگانا پسند نہیں کرتا اس لئے کہ شاید سونے والے کی رُوح اُس وقت جسم سے کہیں دُور گئی ہوئی ہو اور ایسی حالت میں اُسے جگا دیا جائے تو ممکن ہے کہ روح اتنی جلدی واپس نہ آسکے۔

سائنس کے مطابق موت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اِسی مصنف کی کتاب "موت کی حقیقت" کا مطالعہ کریں

بورنیو کے وحشیوں کا خیال ہے کہ جب کوئی بہت بیمار ہو جاتا ہے تو اس کی روح جسم کو چھوڑ کر کہیں چلی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ حکیم کو نہیں بلکہ روح پکڑنے والے کو بلاتے ہیں۔ تاکہ وہ روح کو ڈھونڈ نکالے۔ روح پکڑنے والا کوئی چیز لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ گم شدہ روح نے اس میں گھر بنا لیا ہے۔ اُس چیز کو بیمار کے سر پر ملا جاتا ہے تاکہ بھاگی ہوئی روح دوبارہ بیمار کے جسم میں چلی جائے۔

بعض وحشی اپنی تصویر کھنچوانا پسند نہیں کرتے۔ ایک دفعہ میڈگاسکر کے چند وحشیوں کی ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے تصویر کھینچ لی۔ اپنی تصویر کو دیکھ کر وہ وحشی کہنے لگے کہ ڈاکٹر نے اُن کی روحیں نکال لی ہیں۔ اس خیال سے وہ اتنے پریشان ہوئے کہ ڈاکٹر کو بہانہ کر کے اپنی جان چھڑانی پڑی اس نے اُن وحشیوں کو ایک ٹوکری دے کر کہا کہ اُس نے اُن کی روحیں اُس ٹوکری میں بند کر دی ہیں۔ اور وہ اس میں سے اپنی اپنی روح لے سکتے ہیں۔

وحشی سمجھتا ہے کہ روح بات چیت کر سکتی ہے۔ شکار کھیلتی اور دشمنوں سے لڑ سکتی ہے حتیٰ کہ اُن کا خیال ہے کہ روح کھاپی بھی سکتی ہے۔ اور ناراض ہو جانے پر نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ وحشیوں کا خیال ہے کہ آدمی کے مر جانے کے بعد روح کچھ عرصہ تک اپنے دنیاوی گھر کے نزدیک ہی رہتی ہے۔ اور جو کچھ اس دُنیا میں ہوتا ہے وہ اُسے دیکھتی رہتی ہے۔

جنوبی سمندر میں جزیرۂ حوائی کے اصلی باشندے ایک قصہ سنایا کرتے ہیں اس سے معلوم ہوگا کہ وہ روح کو کتنی ٹھوس اور سچ مچ کی چیز مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مر جانے پر روح بائیں آنکھ سے نکل کر گھر کے کونوں میں مکھی کی طرح اِدھر

اُدھر اُڑتی پھرتی ہے۔ پھر وہ اپنے جسم کے پاس آکر ٹھیر جاتی ہے۔ جسم اُسے ایک پہاڑ کی طرح نظر آتا ہے۔ اور آنکھیں بہت گہرے غار معلوم ہوتے ہیں رُوح اس نظارے سے ڈر کر گھر سے باہر بھاگ جاتی ہے۔ اور چھت پر جاکر بیٹھ جاتی ہے۔ جب اُسکے رشتہ دار زور زور سے روتے اور واویلا کرتے ہیں تو رُوح اس شور وشر سے ڈر کر کسی ناریل کے درخت پر جا بیٹھتی ہے۔ اور ایک درخت سے دوسرے درخت پر اُڑتی ہوئی آخر کار زمین کے نیچے کی دُنیا کے دروازے پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں سے اُسے روحوں کی دُنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

وحشیوں کو ہر جگہ رُوحوں اور بھوتوں کا ہی وہم رہتا ہے۔ اُنھیں محسوس ہوتا ہے کہ بھوت اُن کے دائیں بائیں ہر طرف موجود ہیں۔ رات کو ہوا کی سائیں سائیں میں۔ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں چھپے ہوئے جانوروں کے شور میں غرضکہ ہر نئی اور عجیب آوازیں انھیں روحوں اور بھوتوں ہی کی آوازیں سُنائی دیا کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ ان سے ڈرتے ہیں اس لئے اُن کی خواہش رہتی ہے کہ یا تو روحیں بھاگ جائیں یا اُن سے خوش رہیں۔

اُن تمام باتوں کو جو وحشی لوگ مردوں کی روحوں کو خوش کرنے یا بھگانے کے لئے کرتے ہیں لکھنے کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ ہم یہاں پر صرف چند باتوں کا ہی ذکر کریں گے جو آپ کو یہ سمجھنے میں مدد دیں گی کہ رُوح کا عقیدہ کس طرح بڑھتے بڑھتے مذہب میں تبدیل ہو گیا۔

روحوں کی دعوت

وحشیوں میں جب کوئی مر جاتا ہے تو اسکے رشتہ دار اس کی قبر پر کھانے

پینے کی چیزیں اور کپڑے وغیرہ رکھ دیتے ہیں تاکہ مُردہ کی رُوح اُن چیزوں کا استعمال کر سکے۔ یہ لوگ اپنے سادہ طریقہ سے سوچتے ہیں کہ رُوح کو اُنھی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہوگی جن کی کہ انسان کو ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی بہادر اور لڑاکا مر جاتا ہے تو دوسری چیزوں کے علاوہ اس کے ہتھیار بھی قبر پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے مُلک میں بھی اب تک مردوں کی رُوحوں کو کھانا پانی وغیرہ پہنچانے کے لئے لوگ برہمنوں کو کھلاتے پلاتے ہیں گویا کہ برہمنوں کا پیٹ خدائی لیٹر بکس ہے۔

قبروں پر ہار پھول مٹھائی اور چادریں چڑھانا۔ فاتحہ پڑھنا یہ سب چیزیں اسی بات کو ظاہر کرتی ہیں۔ انگریزوں میں بھی جب کوئی سپاہی مر جاتا ہے اور سپاہیانہ عزت سے اُس کی تجہیز و تکفین کی جاتی ہے تو قبر میں تابوت کو اُتارتے وقت اُس پر اُس سپاہی کی تلوار اور ٹوپی بھی رکھدی جاتی ہے۔ اس کا گھوڑا جنازہ کے ساتھ ساتھ قبر تک لیجایا جاتا ہے۔ مگر آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے تو گھوڑے کو بھی مار کر ساتھ ہی گاڑ دیا جاتا تھا تاکہ گھوڑے کی رُوح دوسری دُنیا میں جاکر سپاہی کو سواری دے سکے۔

وحشیوں کا اگر کوئی بڑا سردار مر جاتا ہے تو وہ اُس کے بہت سے غلاموں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ غلاموں کی روحیں دوسری دنیا میں جاکر اس سردار کی خدمت کریں گی۔ دو تین صدی پہلے پیرو کے باشندوں کا بادشاہ جسے وہ انکا کہتے تھے جب مر جاتا تھا تو اُس کے غلام اور چہیتی بیویاں خودکشی کر لیتی تھیں جس سے وہ بھی اپنے مالک کا ساتھ دے سکیں۔ بعض وحشی تو یہاں تک کرتے تھے کہ سردار کے مرنے سے بھی پہلے خودکشی کر لیتے تھے تاکہ وہ دوسری دُنیا میں پہلے ہی پہنچکر سردار کے لئے آرام و آسائش کا

بندوبست کر سکیں۔

ستی کی رسم میں بھی یہی خیال پوشیدہ تھا۔ عورت اپنے مردہ خاوند کے ساتھ دوسری دنیا میں جانے کے لئے جلتی چتا میں جل جاتی تھی۔ یا دوسرے رشتہ دار ہی اُسے زبردستی آگ میں جھونک دیتے تھے۔

جس طرح ہم وحشیوں سے آئے ہیں اُسی طرح یہ رسم و رواج بھی اُنھی کے رسم و رواج سے نکلے ہیں۔

رُوحوں سے دیوتا

اب تک ہم نے یہ بتایا ہے کہ کس طرح وحشی رُوح اور روحوں کی دُنیا میں یقین کرنے لگے۔ لیکن ہم نے ان کے دیوتاؤں کا ذکر نہیں کیا کیونکہ رُوح کا تخیل ہی رفتہ رفتہ دیوتاؤں میں تبدیل ہوگیا تھا یعنی وحشی روحوں کو ہی پوجنے لگ گئے۔ رُوح سے دیوتا بنا لینا وحشیوں کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہر زبردست رُوح اُن کے لئے دیوتا ہی ہے۔ وہ روحوں سے ڈرتے ہیں اس لئے اُنھیں ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ روحیں اُنھیں کہیں نقصان نہ پہنچائیں روحوں یا دیوتاؤں کا غصہ ٹھنڈا کرنے یا انھیں خوش کرنے کے لئے چڑھاوے چڑھاتے اور قربانی دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ ان پجاریوں سے بھی مدد لیتے ہیں جو کہتے ہیں کہ دیوتا کو وہ جلدی سے خوش کر سکتے ہیں۔

اگر آپ تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو ظاہر ہو جائے گا کہ رُوح سے دیوتا بن جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ بالفرض وحشیوں کے کسی قبیلہ کے سردار کا انتقال ہوگیا جو بہت طاقتور اور بہادر تھا۔ اس کی زندگی میں تمام وحشی اس سے ڈرتے تھے ایسی حالت میں یہ ضروری ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اُس کی رُوح سے لوگ

اتنا ہی ڈریں جتنا کہ اس کی زندگی میں ڈرتے تھے۔ اُس کو خوش کرنے کے لئے اس کی قبر پر یا اس کی یاد میں بھینٹ بھی زیادہ دی جائے گی۔ وہ اُس کی رُوح سے ہمیشہ دُعا کرتے رہیں گے کہ وہ اُن کی طرف سے لڑائی میں لڑتی رہا کرے۔ اور اُن سے ناراض نہ ہو۔ اس بڑے سردار کی رُوح کے مقابلہ میں معمولی آدمی کی رُوح کی کچھ حقیقت نہیں ہو سکتی۔ اس طرح یہ قبیلہ کا سردار رفتہ رفتہ اس قبیلہ کا دیوتا بن جائے گا۔ جب یہ قبیلہ دشمن سے لڑنے جائے گا تو وہ قبیلہ والے اس مردہ سردار سے لڑائی میں فتح دلانے کے لئے دعا مانگیں گے۔

اِنسان کس طرح دیوتا بن گئے؟

اگر آپ کو اس بات میں شک ہے کہ کس طرح انسان دیوتا بن گیا تو اس کی سینکڑوں مثالیں ہمارے مُلک میں ہی مل جائیں گی۔ راجہ رام [illegible] جی جو اپنے وقت کے مہاپُرش تھے آج کروڑوں ہندوؤں کے دیوتا بنے ہوئے ہیں۔ مہاتما بدھ۔ سری کرشن اور جینیوں کے بیسیوں تھیر تھنکر آج دیوتاؤں کا درجہ لئے ہوئے ہیں لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ ان سے ڈرتے ہیں۔ اور اُن سے اپنے مقصد کے لئے پرارتھنا کرتے ہیں

کچھ لوگ تو اب زندہ آدمی کو بھی دیوتا ماننے لگ گئے ہیں۔ چند دن ہوئے مدراس میں گاندھی بھگتوں نے گاندھی جی کی تصویر پر ہار پھول چڑھا کر پوجا کی اور ہاتھ جوڑ کر عہد کیا کہ وہ آئندہ کبھی گوشت نہیں کھائیں گے۔

ساٹھ برس سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا چین کے بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ کنفیوشس کو بھی تمام چینی بادشاہوں (جو دیوتا سمجھے جاتے تھے) کے برابر سمجھا جائے۔

جاپانی بھی اس بات کی مثال ہیں کہ کس آسانی سے انسان دیوتا بن جاتا ہے۔ جاپانی اپنے زندہ اور مُردہ تمام بادشاہوں کو دیوتا سمجھتے ہیں۔ ہر جاپانی

صبح اُٹھنے پر سب سے پہلے بادشاہ کے محل کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتا ہی جاپانی اپنے بزرگوں کی روحوں کی بھی پوجا کرتے ہیں۔

جانوروں سے دیوتا

مذہب کی یہ کہانی نہایت ہی آسان ہوتی اگر انسان نے صرف مُردوں کو ہی دیوتا بنایا ہوتا۔ ایسی صُورت میں ہمیں یہ بتانا ہوتا کہ کس طرح ہر قوم نے اپنے اپنے دیوتا بنا لئے۔ اور کس طرح ہر قبیلہ کے علیحدہ علیحدہ بہت سے دیوتاؤں کے خیال سے ایک دیوتا کا خیال (جو تمام قبیلوں کا دیوتا ہو) پیدا ہو گیا۔ مگر وحشی لوگ انسان کے علاوہ دوسری چیزوں میں بھی رُوح کا وجود مانتے ہیں اُن کا اعتقاد ہے کہ انسان کی طرح تمام جانداروں میں بھی رُوح ہے۔ وحشی اپنے خیال کے مطابق سوچتا ہے کہ انسان میں رُوح ہے اس لئے تمام جانوروں میں بھی رُوح ہے۔ جانور بھی اُسے خواب کی دنیا میں دکھائی دیتے ہیں۔ بہت سے جانوروں کی عادات بھی تو بھوتوں سے ملتی جُلتی ہیں۔ سانپ ہی کو دیکھو چُپ چاپ گھاس میں چھپا ہوا بیٹھا رہتا ہے۔ یہ وہی جانور ہے جس کا ڈسنا موت ہے۔ اُن جانوروں کا خیال کرو جو رات کے بھیانک اندھیرے میں بھوت کی طرح اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وحشی ہر ہلتی جُلتی چیز کو زندہ سمجھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ صرف جانور ہی ایسے نہیں ہیں جو حرکت کرتے ہیں۔ درخت بھی اپنی شاخیں ہلاتے اور پھل پھول اُگاتے ہیں۔ دریا یا آبشار شور مچاتا ہوا بہتا ہے۔ آسمان میں بادل شکلیں بدلتے ہوئے اُڑتے ہیں۔ اسی طرح ہوا اپنے زبردست تھپیڑوں سے بڑے سے بڑے درخت کو گرا دیتی ہے۔ آگ کی لپٹیں اُوپر کو اُٹھتی ہیں اور ہلتی ہوئی دکھائی

دیتی ہیں۔ سورج چلتا ہے۔ چاند گھٹتا بڑھتا اور حرکت کرتا ہے۔ ستارے کبھی نظر آتے ہیں اور کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ کبھی کبھی زمین بھی ہلنے لگتی ہے۔

قدرتی دیوتا

وحشی قوانین قدرت سے بالکل ناواقف ہے۔ وہ اپنے سادہ طریقہ سے سوچتا ہے کہ ہر وہ چیز جو زندہ ہے۔ ہلتی جلتی ہے اس لئے جو چیز حرکت کرتی ہے ضرور زندہ ہے۔ کیونکہ رُوح ہی کے باعث آدمی زندہ رہتا اور حرکت کرتا ہے اس لئے ہر حرکت کرنے والی چیز میں رُوح ضرور ہے یہی وجہ ہے کہ وحشی کو انسان۔ سانپ اور دریا میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ وہ ان سب کو زندہ سمجھتا ہے۔ سانپ اور دریا کی رُوح سے بھی وہ ویسے ہی ڈرتا ہے جیسے کہ انسان کی رُوح سے۔ انھیں خوش کرنے کے لئے وہ ان کی بھی پوجا کرنے لگتا ہے۔ اس طرح وحشی ان چیزوں کو بھی دیوتا بنا دیتا ہے۔ اس کی دُنیا دیوی دیوتا اور بھوت پریتوں سے ہی بھری ہوئی ہے۔ وہ ہر غیر معمولی بات کا کارن کسی دیوتا کی ناراضی یا خوشی میں سمجھتا ہے۔ اگر فصل کے وقت پانی نہیں برسا تو بارش کا دیوتا ناراض ہے۔ سیلاب آجائے اور اس کی جھونپڑی اور مویشی بہہ جائیں تو دریا کا دیوتا ناخوش ہے۔ وہ سورج گرہن سے یہ خیال کرتا ہے کہ سورج دیوتا ناراض ہو کر دُنیا سے اپنا منہ چھپا رہا ہے۔ اور اگر کوئی بیمار ہو گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دیوتا اُن کے کسی فعل سے ناخوش ہو کر اُنھیں سزا دے رہا ہے چنانچہ جاہل کے لئے تمام قدرتی باتوں کے اسباب بتانے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے۔ وہ ہر بات میں کسی نہ کسی دیوتا کا ہاتھ سمجھتا ہے۔ آسٹریلیا

کے کسی جاہل سے پوچھو کہ آتش فشاں پہاڑ سے دھواں کیوں نکلتا ہے تو وہ جواب دے گا کہ اس پہاڑ میں بہت بڑے بڑے بھوت رہتے ہیں جو پہاڑ کے نیچے آگ جلاتے ہیں

پیرو کے وحشی سے سوال کرو کہ کٹورے میں رکھا ہوا پانی کیوں سوکھ جاتا ہے تو وہ بتائے گا کہ سورج دیوتا نے پی لیا۔ اگر کسی گنوار ہندوستانی سے دریافت کرو کہ زمین کیوں ہلنے لگتی ہے تو جواب ملے گا کہ زمین کو ایک بہت بڑے بیل نے اپنے سینگوں پر اُٹھایا ہوا ہے۔ جب وہ تھک جاتا ہے اور ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر زمین کو ٹکاتا ہے تو زلزلہ آتا ہے۔

ہم آپ کو ایک بہت لمبی فہرست ایسے دیوتاؤں کی دے سکتے ہیں جن کی ہمارے وحشی بزرگ پوجا کرتے رہے ہیں۔ اور پچھڑے ہوئے ممالک میں تو اب تک وہی رسم ورواج جاری ہیں۔ اُس فہرست میں سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

(۱) قدیم زمانے میں اہل مصر گائے۔ بیل۔ سانپ۔ بلّی۔ مگرمچھ۔ عقاب کیڑے۔ مکوڑے اور کئی قسم کے جانوروں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ سانپ کی پوجا تو کسی نہ کسی زمانے میں دُنیا کے ہر حصّہ میں ہوتی رہی ہے۔ جانوروں کی پوجا کا نمونہ اب تک ہندوستان میں ملتا ہے جہاں گائے۔ بیل۔ سانپ وغیرہ کو متبرک سمجھکر پوجا جاتا ہے۔

(۲) درختوں کی پوجا بھی ہوتی رہی ہے۔ جزیرۂ فلپائن کے باشندے کئی قسم کے درختوں کو اس لئے نہیں کاٹتے کہ اُن کا عقیدہ ہے کہ اُن کے باپ دادوں کی روحیں اُنہی درختوں پر رہتی ہیں۔ سیام میں درخت کے کاٹنے سے پہلے اُس پر کھانا چڑھاتے ہیں۔ اسی طرح آسٹریلیا میں لکڑہارا درخت کو

کاٹنے سے پہلے درخت سے معافی مانگ لیتا ہے۔ ہندوستان میں بھی پیپل کو کاٹنا پاپ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس پر رُوحیں رہتی ہیں۔ اور تلسی نامی پودے کی بھی قدیم خیال کا ہندو خصوصاً عورتیں پوجا کرتی ہیں۔

(۳) دریا دیوتا اب تک بہت سے مُلکوں میں کثرت سے ملتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی گنگا۔ جمنا۔ سرجو وغیرہ بہت سے دریا ہیں جنہیں دیوی دیوتا سمجھکر پوجا جاتا ہے۔

(۴) پتھر بھی دُنیا کے ہر حصہ میں پوجا جاتا تھا اور اب تک بعض ممالک میں قدیم زمانہ کی یہ رسم قائم ہے۔ ہندوستان کے چپہ چپہ پر پتھروں کی مختلف قسم کی مورتیاں مندروں میں رکھی ہوئی پائی جاتی ہیں جن کی صبح و شام بڑی شان و شوکت سے پوجا کی جاتی ہے۔

ہر سال لاکھوں مُسلمان دور و دراز سے سفر کرکے مکہ میں کالے پتھر یا سنگِ اسود کی پوجا کرنے جاتے ہیں۔ انگلستان کے بادشاہ کی رسم تاجپوشی اب تک ایک ایسے پتھر پر کی جاتی ہے جسے متبرک سمجھا جاتا ہے۔

پہاڑوں کی بھی پوجا ہوتی رہی۔ میرو اور کیلاش پربت اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

(۵) اسی طرح آگ کی بھی پوجا ہوتی رہی ہے۔ اہل ہنود کے ہَوَن اور پارسیوں کی متبرک آگ اُسی زمانہ کی یادگاریں ہیں۔ رومن کیتھولک گرجوں میں ہمیشہ ایک چراغ جلتا رہتا ہے جسے کبھی بجھنے نہیں دیا جاتا۔

(۶) چاند ستارے اور سب سے زیادہ سورج کی پوجا تو کئی قوموں نے کی ہے۔ کسی نہ کسی زمانے میں پیرو۔ میکسیکو۔ مصر۔ فارس۔ چین۔ یونان۔ روم اور دوسرے ممالک میں سورج کی پوجا ہوتی رہی ہے۔ اور ہندوستان میں ابتک ہوتی ہے۔

سب سے بڑا دیوتا

اگر ہم وحشی ہوتے اور ہم سے کہا جاتا کہ ان تمام دیوتاؤں میں سے کوئی دیوتا اپنے لئے پسند کر لو تو ہم سورج کو پسند کرتے۔ کیونکہ سورج کی وجہ سے ہی زمین پر زندگی قائم ہے۔ اسی کی وجہ سے پھل پھول اور گیہوں پیدا ہوتے ہیں۔ سورج سردی سے بچاتا ہے۔ روشنی اور گرمی دیتا ہے۔ اس بات کو ہمارے وحشی آباواجداد نے ہم سے بھی زیادہ محسوس کیا ہوگا۔ کیونکہ ہماری طرح اُن کے پاس سردی سے بچنے کے لئے آرام دہ مکانات نہ تھے۔ روشنی کا انتظام نہ تھا اور برفانی علاقوں میں تو سورج کی گرمی کے بغیر رہنا ہی مشکل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرد ممالک میں پرانے زمانے میں لوگ موسم گرما کے آخر میں جب کہ سورج آسمان میں سب سے نیچے نظر آتا ہے ایک تہوار مناتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے کہ اب دن بدن سورج کی گرمی بڑھتی جائے گی۔ یہ موسم سرما کا تہوار اب تک عیسائیوں میں بڑے دن یا کرسمس کی صورت میں چلا آتا ہے۔

تمام مذاہب کی ابتداء

اتنا تو ہم نے سمجھ ہی لیا ہے کہ رُوحوں اور بھوتوں کا عقیدہ کیسے شروع ہوا۔ کس طرح سرداروں کی روحیں پوجی جانے لگیں۔ جیسے درخت۔ پانی۔ پتھر۔ پہاڑ۔ آگ۔ سورج وغیرہ میں رُوح کا خیال پیدا ہوا۔ اور آخر میں یہ سب دیوتا سمجھ کر پوجے جانے لگے۔ اتنے دیوتاؤں کے ہجوم میں کچھ تعجب نہیں اگر بہت سے مذہبوں کا بھی ہجوم ہو جائے۔ ہر قبیلہ اُن رُوحوں کو ہی سب سے زیادہ طاقتور سمجھتا تھا جن کی وہ پوجا کرتا تھا۔ اُن ہی کے مندر بناتا اور اُنہی کی یادیں تہوار اور

مذہبی رسمیں جاری کرتا تھا۔ اصل میں ہر قبیلہ کا مذہب اس قبیلہ کے رسم و رواج کا ایک حصہ تھا۔ جس طرح ہر قبیلہ کے الگ الگ رسم و رواج تھے اُسی طرح اُن کے علیحدہ علیحدہ دیوی دیوتا بھی تھے۔ اس طرح لوگ بے شمار دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگ گئے۔

ایک دیوتا (خدا) کے ماننے والے کہتے ہیں کہ صرف ایک ہی دیوتا (خدا) ہے جو تمام کائنات پر حکومت کرتا ہے۔ فقط اُسی کی پوجا کرو۔ اور سب اُسی سے مانگو۔ لیکن جب ایک وحشی لڑائی میں فتح چاہتا ہے تو وہ قبیلہ کے جنگ کے دیوتا کی پوجا کرنے لگتا ہے۔ فصل کے لئے بارش کی ضرورت ہو تو بارش کے دیوتا سے دعا مانگتا ہے۔ اور جب وہ بیمار ہو جاتا ہے تو اُس کے رشتہ دار اُس دیوتا کی پوجا کرتے ہیں جس نے ناراض ہو کر وہ مرض بھیجا ہے۔ اس کے برعکس ایک دیوتا کے ماننے والے فتح۔ بارش۔ بیماری۔ غرض کہ ہر چیز کے لئے اُسی ایک دیوتا سے دعا کرتے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں جرمن اور انگریز دونوں اُسی ایک خدا سے جنگ میں فتح کے لئے دُعا مانگتے تھے۔

کئی دیوتاؤں سے ایک دیوتا کی طرف

گو ہمارے وحشی آبا و اجداد بہت سے دیوتاؤں کی پوجا کیا کرتے تھے لیکن اُن سب دیوتاؤں کا ایک برابر درجہ نہیں مانا جاتا تھا۔ بعض کا درجہ بہت اونچا تھا تو بعض بہت طاقتور سمجھے جاتے تھے۔ بعض نہایت غصہ ور اور خوفناک تھے۔ ان کے علاوہ بعض دیوتاؤں کو صرف ایک ہی قسم کا کام کرنا پڑتا تھا مثلاً بارش برسانا۔ بیماری کو دُور رکھنا وغیرہ۔ چونکہ وحشی زیادہ تر ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے اِس لئے قبیلوں کا سب سے زیادہ ضروری دیوتا وہ تھا جو اُنھیں

جنگ میں فتح دلا سکتا تھا۔

قدیم زمانہ میں یونانی اور رومن لاتعداد دیوتاؤں کو مانتے تھے ہندوؤں کے تو آج تک بھی بے شمار دیوتا ہیں۔ ان تمام دیوتاؤں کے سردار کو اہل روم جوپیٹر اور یونانی زیوس کہتے تھے۔ اسی طرح دیوتاؤں کے دیوتا کو اہل ہنود وشنو کہتے ہیں۔ دیوتاؤں کے بارے میں روایتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیوس۔ جوپیٹر یا وشنو دوسرے دیوتاؤں کے معاملات میں دخل نہ دیتا تھا۔ اور اگر وہ شرارت کرتے تھے تو اُنھیں روکتا بھی تھا۔

اچھے اور بُرے دیوتا

شاید دیوتاؤں کے شرارت کرنے کے خیال سے آپ متعجب ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اچھے اور بُرے دونوں قسم کے دیوتا مانے جاتے تھے۔ یہ دیوی دیوتا زیادہ تر انسانوں کی سی حرکتیں کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی شرارتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ اُنھیں غصہ آتا تھا۔ جھوٹ بولتے تھے۔ ایک دوسرے کی چوری کرنا اور دھوکا دینا اُن سے بعید نہ تھا۔ اصل میں اہل مصر و روم نے اِن دیوتاؤں کو اپنے خیال اور قیاس کے مطابق ہی بنایا تھا۔

"ہمارا خدا" اور خدا

دوسری قدیم قوموں نے بھی اپنے قبیلوں کے دیوتاؤں کو ایسا ہی بنایا تھا۔ اُن کے دیوتا بھی انسانوں کی طرح ہی سلوک کرتے تھے۔ انجیل کے پُرانے عہدنامہ میں "یہوواہ" کے متعلق ذکر ہے کہ وہ یہودیوں کے قبیلہ کا دیوتا تھا۔ اور باغ عدن میں شام کے وقت چہل قدمی کیا کرتا تھا۔ آدم و

حوا سے ایسی باتیں کیا کرتا تھا جیسے ایک باپ اپنے بچوں سے کرتا ہے۔ اس سے آگے درج ہے کہ جے ہووا کی پوجا میں جلائی ہوئی چیزوں کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ خوش ہوا۔ جے ہووا کو بھی حاسد دیوتا بتایا گیا ہے۔ وہ لوگوں کے کہنا نہ ماننے اور اُس کے مقابلہ میں کسی دوسرے دیوتا کی پوجا کرنے پر اُن سے ناراض ہو جاتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے میں جے ہووا کے علاوہ دوسرے دیوتاؤں کی بھی پوجا ہوتی تھی۔ یہودیوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ دوسرے قبیلوں کے دیوتاؤں کے مقابلہ میں جے ہووا کو ترجیح دی جائے۔ چنانچہ جب یہودی کسی دوسرے قبیلے پر فتح حاصل کر لیتے تھے تو ہارے ہوئے قبیلے کو جے ہووا کے سامنے جھکنے اور پوجا کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ بعد میں یہی رسم دیوتا کی بجائے فاتح بادشاہ کے حق میں حلف وفاداری لینے کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ یہودیوں کا جے ہووا بھی ایک قسم کا روحانی بادشاہ تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ جے ہووا جنگ میں اُن کی اسی طرح رہنمائی کرتا ہے جس طرح ایک بادشاہ کو اپنی فوج کی کرنی چاہیئے۔ انجیل میں یہ بھی درج ہے کہ عام بادشاہوں کی طرح جے ہووا بھی ہر بار لڑائی میں فتحیاب نہ ہو سکا۔ یہودی دشمن کو اس لئے شکست نہ دے سکے کہ دشمن کے رتھ لوہے کے تھے۔ پُرانا عہد نامہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح مغربی ممالک میں رفتہ رفتہ جے ہووا کے رقیب دیوتاؤں کی پرستش کو بند کیا گیا۔ یہاں تک کہ جے ہووا کے سوا کوئی اور دیوتا ہی نہ رہا۔ اور یہ کہ یہودی ہی جے ہووا کے خاص پیارے ہیں۔ اسی لئے جے ہووا ہمیشہ ان کی مدد کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی خود کو دوسروں سے علیحدہ رکھتے ہیں۔ خاص خاص چیزیں ہی کھاتے ہیں۔ اور یہودی کے سوا کسی سے شادی نہیں کرتے۔

لیکن یہودیوں کے اس خیال کے باوجود کہ صرف اُنہی کا خدا سچا خدا ہے دوسری قوموں کو ایک خدا کے خیال سے کوئی روک نہ سکا جب عیسائی گرجہ میں یہ بھجن گاتے ہیں کہ "جے ہووا کے تخت کے سامنے" تو اُن کا مطلب یہودی قبیلہ کے دیوتا سے نہیں ہوتا جو باغ عدن میں گھومتا تھا جسے موسیٰ نے نطور پر دیکھا تھا۔ اور جو یہودیوں کو جنگ میں اس لئے جتا نہ سکا کہ دشمن کے رتھ لوہے کے تھے۔ بلکہ لفظ جے ہووا سے ان کا مطلب اُس خدا سے ہوتا ہے جو قدیم یہودیوں کے جے ہووا سے پیدا ہوا تھا۔ یہ نیا جے ہوا محض یہودی قبیلہ کا ہی خدا نہیں ہے۔ بلکہ تمام انسانی نسل کا خدا ہے۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ یہ نیا خدا بھی صرف عیسائیوں کو ہی پیار کرتا ہے۔ اور اُنہی کو جنت میں بھیجے گا۔

اسی طرح کروڑوں دیوتاؤں کے مُلک ہندوستان میں بھی ایک دیوتا کا خیال اکثر لوگوں کے ذہن میں آتا رہا ہے۔ اور کئی مہا پُرش اپنے اپنے زمانہ میں اس خیال کا پرچار بھی کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر شت پتھ اُپنشد کا مصنف تلقین کرتا ہے کہ بہت سے دیوتاؤں کو چھوڑ کر صرف ایک دیوتا کی پوجا کرو

योऽन्यां देवतामुपास्ते न स वेद यथा पशुरेव स देवनाम्॥ शतपथ कां १४ अ०४

یعنی جو (ایک دیوتا کے سوا) کسی اور دیوتا کی پوجا کرتا ہے وہ کچھ نہیں جانتا۔ اور عقلمندوں میں وحشی کی طرح ہے۔

مگر اس میں سب سے زیادہ کامیابی سوامی دیانند جی کو ہوئی ہے اُنھوں نے کروڑوں دیوتاؤں کی بجائے صرف ایک دیوتا کی پوجا کرنے کی تعلیم دی ہے۔ رفتہ رفتہ اس تعلیم کا اثر ہوا اور ہندؤوں کے لاتعداد دیوتاؤں کی جگہ آریوں کا ایک دیوتا رہ گیا ہے۔

ہم نے چند سطروں میں ہی اُن تمام تبدیلیوں کا ذکر کر دیا ہے جن کے واقع ہونے میں ہزاروں برس صرف ہوئے ہیں۔ رُوحوں کے خیال سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر انسان مختلف دیوتاؤں کے خیال تک پہنچا ہے۔ اور بہت سے دیوتاؤں سے رفتہ رفتہ قادر مطلق دیوتا کا خیال پیدا ہوا تھا۔ جس طرح ہزاروں برس میں وحشی بزرگوں سے ترقی کرتے ہوئے ہم موجودہ تہذیب اور عروج تک پہنچے ہیں اُسی طرح ہمارے مذاہب بھی ہمارے قدیم باپ دادوں کے مذاہب سے نکلے ہیں۔

کچھ قومیں ابھی تک روحوں اور بھوتوں کے یقین کے درجہ سے آگے نہیں بڑھی ہیں اور وہ ابھی تک جاہل مطلق اور وحشی ہیں۔ بعض قومیں بے شمار دیوتاؤں کو پوجنے کے درجے تک ہی پہنچی ہیں۔ مگر سب سے زیادہ ترقی اُن لوگوں نے کی ہے جو ایک قدم اور آگے بڑھ کر صرف ایک دیوتا میں یقین کرنے کے درجہ تک پہنچ گئے ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے کے اعلیٰ مذاہب میں بھی ابھی تک ایسے نشانات موجود ہیں جو زمانۂ وحشت کی یادگاریں ہیں۔ مثلاً عیسائیت میں دراصل ایک سے زائد دیوتا ہیں۔ باپ۔ بیٹا اور روح القدس۔ یہ تینوں دیوتا تو نیک ہیں اور چوتھا دیوتا شیطان ہے جو بُرا ہے۔ گو اس چوتھے دیوتا کی پوجا نہیں ہوتی پھر بھی یہ دیوتا تینوں دیوتاؤں کا مقابلہ کرتا ہے۔ رومن کیتھولک عیسائی تو ان کے علاوہ بی بی مریم اور لاتعداد دیویوں کی پوجا کرتے ہیں

اسی طرح اسلام میں دو دیوتا ہیں۔ ایک نیک دیوتا جس کی پوجا کی جاتی ہے۔ اور دوسرا بد دیوتا جسے شیطان کہا جاتا ہے۔ شیطان نے خدا کا مقابلہ کرنے کی جرأت کی ہے۔ اور خدا کے کاموں میں دخل دیتا رہا ہے۔ رومن کیتھولک

عیسائیوں کی طرح بعض مسلمان بھی قبروں کی پوجا کرتے ہیں۔

اگر آپ ان تمام باتوں پر تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ باتیں اُن وحشیوں کی یاد دلاتی ہیں جن کی دُنیا ہی دیوی دیوتا اور روحوں سے بٹی پڑی تھی۔ اور یہ سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں کہ ہزاروں برس پہلے کے وحشی بزرگوں کے رسم ورواج کا یہ ورثہ انسان کو پُشت در پُشت ملتا آرہا ہے۔

بُرے دیوتا

شیطان کے ذکر سے ایک بات اور یاد آگئی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ مذاہب ادنیٰ مذاہب سے ہی نکلے ہیں۔ وحشی نیک و بد دونوں طرح کے دیوتاؤں میں یقین رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام قسم کی روحوں سے ڈرتا رہتا ہے۔ اُسے یہ خیال رہتا ہے کہ روحیں فائدہ پہنچانے کی نسبت نقصان زیادہ پہنچا سکتی ہیں۔ اس کی تمام مذہبی رسومات۔ پوجائیں اور قربانیاں صرف اس لئے ہوتی ہیں کہ وہ دیوتاؤں کو منائے رکھے جس سے وہ اُسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچائیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ ادنیٰ مذاہب میں نیک دیوتاؤں کی نسبت بُرے دیوتاؤں کی زیادہ پوجا اور آؤ بھگت ہوتی ہوگی۔ قدیم مصر میں سب سے بڑا اور نیک دیوتا اسائرس تھا۔ اور سیٹ بُرا اور خوفناک تھا۔ مگر سیٹ کی اسائرس کی نسبت بہت زیادہ پوجا ہوتی تھی۔ کیونکہ اسائرس نیک اور رحمدل تھا اس لئے اس کی پوجا نہ بھی ہو تو کوئی خاص ہرج نہیں۔ مگر سیٹ کی جو بیماری اور موت بھیج سکتا تھا۔ فصلیں بگاڑ سکتا تھا۔ بہت زیادہ پوجا کی جاتی تھی تاکہ وہ خوش رہے۔

جب لوگ کئی دیوتاؤں کی بجائے ایک دیوتا کو ماننے لگے تو بعض لوگوں کا خیال ہوا کہ وہی ایک دیوتا خیر و شر دونوں بھیجتا ہے۔ جیسے قدیم یہودی لیکن دوسرے جو اس درجہ تک نہ پہنچے تھے وہ دو دیوتاؤں کو مانتے تھے مثلاً پارسی جو ایک دیوتا خیر اور نیکی کا اور دوسرے کو شر اور برائی کا دیوتا مانتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اورمزد جو روشنی یا نیکی کا دیوتا ہے ہمیشہ تاریکی یا برائی کے دیوتا اریہی مان سے لڑتا رہتا ہے۔ اس سادہ طریقہ سے وہ بتاتے ہیں کہ اچھائی اور برائی دونوں کیوں دنیا میں موجود ہیں۔ یہ مذہب سکھاتا ہے کہ ہر شخص کو خیر و شر کی اس جنگ میں برائی کو مار کر اور اچھائی کو عمل میں لا کر شامل ہونا چاہیئے۔

مذاہب کی ترقی اور تبدیلی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تمام اعلیٰ مذاہب میں اب بھی ابتدائی ادنیٰ مذاہب کی بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اور اُن اعلیٰ مذاہب نے ایک دوسرے سے بھی کافی مدد لی ہے۔ چنانچہ جب قدیم یہودی بابل میں مقید تھے تو وہ ایسے لوگوں میں رہتے تھے جو پارسیوں کی طرح نیکی کے دیوتا کے علاوہ برائی کے دیوتا کو بھی مانتے تھے۔ قید ہونے سے پہلے جیسا کہ ہم اوپر بھی درج کر آئے ہیں یہودیوں کا خیال تھا کہ اُن کے قبیلہ کا دیوتا ہی برائی اور اچھائی دونوں بھیجتا ہے لیکن اُنھوں نے برائی کے ایک علیحدہ دیوتا کا خیال بابلیوں سے لیا۔ اور اپنے مذہب کا بھی حصہ بنالیا۔ اس طرح سے شیطان یہودی مذہب میں آیا۔ اور چونکہ عیسائی مذہب یہودی مذہب سے پیدا ہوا ہے اس لئے عیسائیت میں بھی یہودی مذہب کی طرح نیک و بد دیوتاؤں کا خیال موجود ہے۔ اسی طرح مذہب اسلام بھی جو یہودی اور عیسائی مذاہب کی پیداوار ہے اس

خیال کا حامل ہے۔

مذہب میں سب سے عجیب بات

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ہم مذہب کی سب سے عجیب بات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ وحشی قبروں پر کھانے پینے کی چیزیں رکھ دیتے تھے۔ تاکہ مُردوں کی رُوحیں اُن کا استعمال کر سکیں۔ اور یہ بھی یاد ہو گا کہ وحشیوں کے کسی سردار کے مرجانے پر کس طرح عورتوں اور غلاموں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس کھانے پینے کی چیزوں کی بھینٹ اور جانداروں کے قتل سے ایک مذہبی رواج شروع ہو گیا جسے عام طور پر قربانی کہا جاتا ہے۔

جب کوئی بڑا سردار مرجاتا تھا تو اس کے جنازے پر بھینٹ زیادہ چڑھائی جاتی تھی اور غلام بھی زیادہ تعداد میں قتل کئے جاتے تھے۔ اور اگر اُس سردار کو وہ لوگ دیوتا مان لیتے تھے تو وہ صرف جنازہ کے وقت ہی بھینٹ اور قربانی دے کر خاموش نہیں ہو جاتے تھے بلکہ وہ بار بار ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر ایسے موقع پر تو وہ ضرور ہی قربانی دیتے تھے جب وہ یہ سمجھتے تھے کہ اُس سردار کی رُوح اُن سے ناراض ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی دیوتا یا رُوح سے مُراد مانگتے تھے تو اُسے خوش کرنے کے لئے بڑی سے بڑی چیز کی بھینٹ چڑھاتے تھے۔

انسانی قربانی

سب سے بڑی چیز اگر کوئی بھینٹ کر سکتا ہے تو وہ انسان کی جان ہی ہے۔ اس لئے لوگ دیوتا کو خوش کرنے کے لئے انسان کی قربانی دیتے تھے۔ اُس قدیم زمانہ میں ساری دُنیا میں مردوں اور عورتوں کو فرضی دیوتاؤں

کے سامنے قربان کیا جاتا تھا۔ مصر میں خوبصورت اور کنواری لڑکیاں دریائے نیل میں ڈالدی جاتی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس سے نیل دیوتا خوش ہوتا ہے۔

وحشی مذاہب میں انسانی قربانی تو معمولی بات تھی ہی بلکہ بعض قبیلوں میں تو انسانی قربانی کا گوشت تک کھانے کا رواج تھا۔ مذہبی تاریخ میں مردم خوری ہی سب سے زیادہ حیرت انگیز اور خوفناک چیز ہے۔ لیکن ایسا کرنے کی بھی وجہ تھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وحشی انسانی گوشت اس لئے کھاتے ہیں کہ انھیں کھانے کی دوسری چیزیں نہیں ملتیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مردم خوری اس لئے نہیں کرتے کہ وہ بھوکے مرتے ہوتے ہیں۔ بلکہ اُن کا خیال ہے کہ انسانی گوشت کھانے سے اُن میں اُس انسان کی طاقت آجاتی ہے۔ بعض وحشی جب کسی ایسے دشمن کو مار لیتے ہیں جو بہادر اور لڑاکا ہو تو اُس کا خون پی لیتے ہیں تاکہ اس خون کے ذریعہ دشمن کی بہادری اُن کے جسم میں سرایت کر جائے

قدیم زمانے میں جنوبی امریکہ کے علاقۂ میکسیکو کے باشندے کسی غیر قوم کے آدمی کو پکڑ لیتے تھے اور دیوتا کے سامنے اُس کی قربانی دینے سے پہلے اس آدمی کا نام دیوتا کے نام پر رکھ دیتے تھے۔ اُسے دیوتا کے سے کپڑے اور زیور بھی پہنا دیتے تھے۔ جس طرح وحشی انسانی گوشت کو طاقت بڑھانے کے خیال سے کھاتے ہیں اُسی طرح یہ لوگ بھی انسان کو دیوتا جیسا بنا کر قربان کر دیتے تھے اور جب وہ اس قربانی کے گوشت کو کھاتے اور خون پیتے تھے تو وہ سمجھتے تھے کہ اُن کے اندر دیوتا کا اثر آگیا ہے۔

ہمارے خیال میں آپ اس سے متفق ہوں گے کہ وہ لوگ نہایت

بے رحم اور وحشی تھے جو انسان کو قتل کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ مگر جیسے جیسے انسان زیادہ عقلمند اور مہذب ہوتا گیا وہ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسانی قربانی کی بجائے کوئی اور ذریعہ تلاش کرنے لگا۔ اور اس طرف سب سے پہلا قدم آدمی کی بجائے جانور کو قربان کرنا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں جے ہوواہ نے حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے اسحاق کو قربان کر دے۔ قربانی کے عین وقت پر اسحاق کی قربانی نہ کر کے بھیڑ کی قربانی کی گئی۔ اس طریقہ سے حضرت ابراہیمؑ نے ایک نہایت ہی وحشیانہ مذہبی رسم کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ جانوروں کی قربانی انسانی قربانی کی نسبت کم وحشیانہ فعل ہے۔ رفتہ رفتہ بعض قومیں جانوروں کی قربانی کو بھی چھوڑ کر روٹی اور شراب کو ہی دیوتا کا گوشت اور خون سمجھ کر استعمال کرنے لگ گئیں۔ عیسائیوں میں اس کا اب تک رواج ہے

ہندوستان میں مہاتما بدھ کے زمانے کے بعد سے جانوروں اور انسانوں کی قربانی کے بجائے پھل پھول، مٹھائی وغیرہ کی بھینٹ کا رواج ہو گیا ہے۔ لیکن اب تک بعض دیوتاؤں کے سامنے بھینسے اور بکرے قربان کئے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی انسانی قربانی کی بھی اخبارات کے ذریعہ اطلاع ملجاتی ہے۔

چنانچہ یہ قربانی کا رواج ہزاروں برس پہلے کے وحشی بزرگوں کے مذہبی رواج سے ترقی کرتے کرتے اب اس درجہ تک پہنچ گیا ہے۔



نیکی اور بدی کیا ہے؟

ہم اچھے کام ہی کیوں کریں ؟ کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ہمیں نیک کام ہی کیوں کرنے چاہئیں؟ یہی سوال ہم نے مختلف خیال کے لوگوں سے کیا تو مختلف جوابات ملے مثلاً :-

ایک چھوٹی جماعت کے طالب علم نے جواب دیا کہ اُس کے ماں باپ اور اُستاد ایسا کرنے کے لئے کہتے ہیں ۔ اس لئے وہ اچھے کام کرتا ہے ۔ اگر وہ بُرے کام کرتا ہوا پکڑا گیا تو وہ ناراض ہوں گے ۔ اور سزا دیں گے ۔

مذہب والوں سے پوچھا تو فرمایا کہ مذہبی کتابوں کی تعلیم ہے کہ اچھے کام کرنے سے سورگ یا جنّت ملتی ہے ۔ اور بُرے کام کرنے سے نرک یا جہنّم میں پھینک دیا جاتا ہے ۔ جہاں بے حد تکلیفیں دی جاتی ہیں ۔

وکیل صاحب سے دریافت کیا تو کہا کہ بُرے آدمیوں کو پولیس پکڑ لیتی ہے ۔ قید وغیرہ کی سزا ملتی ہے ۔ اس لئے اچھے کام کرنا چاہئیں ۔

فلسفی نے کہا کہ اچھے آدمی ہمیشہ خوش رہتے ہیں اور بُرے آدمیوں سے لوگ نفرت کرتے ہیں ۔ اس لئے اچھے کام کرنا چاہئیں ۔

ایسے ہی ہم چند جوابات اور بھی درج کر سکتے ہیں ۔ لیکن انہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ خیر و شر یا نیکی و بدی کا مسئلہ ایک پیچیدہ معمہ ہے ۔ ان جوابات سے یہ مسئلہ پُوری طرح حل ہوتا نظر نہیں آتا ۔ کیونکہ تمام مذہبی کتابوں کے ظہور سے پہلے بھی دُنیا میں اچھے بُرے سبھی طرح کے لوگ موجود تھے جنہوں نے ان کتابوں کا کبھی نام بھی نہیں سُنا تھا ۔ اس زمانہ میں لوگ اس لئے اچھے نہیں

تھے کہ ان مذہبی کتابوں نے انھیں نیکی کی تعلیم دی تھی بلکہ اُن کے اچھے ہونے کے اسباب کچھ اور ہی تھے۔ اسی طرح قانون۔ عدالتیں اور پولیس بھی تھوڑے ہی عرصہ کی ایجاد ہیں۔ ان سے پہلے بھی لوگ نیکی کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین زمانہ اور ضرورت کے لحاظ سے بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ یہ جانکر آپ کو تعجب ہوگا کہ اچھائی اور بُرائی کا مطلب بھی مختلف زمانوں میں مختلف سمجھا گیا ہے۔ کل جس چیز کو اچھا گنا جاتا تھا وہ آج بُری ہے۔ کسی مُلک میں جو چیز اچھی ہے دوسرے مُلک میں وہی چیز بُری ہو اگر غور سے دیکھا جائے تو اچھائی بُرائی رسم و رواج کا دوسرا نام ہے۔ مثال کے طور پر اُس زمانہ کا خیال کریں جب لوگ دیوتا کے سامنے انسان کو قربان کرنا اچھا سمجھتے تھے۔ اُن غازیوں کو یاد کرو جو خدا کے نام پر خدا ہی کے بندوں کو قتل کرنا اُن کے بیوی بچوں کو لونڈی غلام بنانا ثواب جانتے تھے ستی کی رسم ہی کو دیکھو کہ زندہ عورت کو مُردے کے ساتھ جل جانے پر مجبور کیا جاتا تھا ہسپانیہ کے پادری رومن کیتھولک مذہب کو نہ ماننے پر لوگوں کو ایذا دینا زندہ جلا دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ راجپوت معصوم ننھی بچیوں کو پیدا ہوتے ہی بزدلانہ طریقہ سے گلا گھونٹ کر مار دیتے تھے۔

مندرجہ بالا باتیں ہمیں نہایت ہی ہولناک اور سنگدلانہ معلوم ہوتی ہیں لیکن جن لوگوں نے یہ افعال کئے ہیں وہ اُن کو اچھا سمجھتے تھے۔ سو برس پہلے انگلستان میں ہی صرف ایک بھیڑ چُرانے کے جُرم میں پھانسی دیدی جاتی تھی۔ غرض کہ اچھائی اور بُرائی کا مطلب زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔

فی زمانہ بھی ایسے رسم و رواج ہیں جنھیں ہم بُرا سمجھتے ہیں۔ افریقہ میں کچھ قبیلے جوڑواں بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیتے ہیں۔ بہت سے وحشی قبیلے لاچار

اور ایاہج بڈھوں کو مار دینا بُرا نہیں سمجھتے۔ اگر ہندو مُردہ کو جلانا اچھا سمجھتا ہے تو مسلمان زمین میں دفنانا اور پارسی مُردہ کو چیل کوّوں کو کھلانا ہی ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اگر ایک مذہب کسی کام کو اچھا سمجھتا ہے تو دوسرا اُسی فعل کو بُرا بتاتا ہے۔ بعض کام جو انگلستان میں اچھے سمجھے جاتے ہیں وُہی ہندوستانیوں کے نزدیک بُرے ہیں۔ چنانچہ اچھے بُرے کا معیار مختلف ممالک اور مختلف قوموں میں بھی مختلف ہے۔

جس طرح مذہب کے متعلق انسان کے خیالات زمانہ اور تجربہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں اُسی طرح اچھائی اور بُرائی کے معیار میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے۔ اس لئے اگر ہم ایک دفعہ یہ سمجھ لیں کہ لوگ بعض افعال کو اچھا اور بعض کو بُرا کیسے کہنے لگے تو ہم اس سوال کا بھی جواب دے سکیں گے کہ ہم اچھے کام ہی کیوں کریں۔

جانوروں میں اچھے اور بُرے کی سمجھ

آپ کہہ سکتے ہیں کہ جانور نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ محض حیوان ہیں۔ مگر کبھی آپ نے کُتا پالا ہو تو آپ جانتے ہوں گے کہ کتّے کو یہ سکھانا کہ چند باتیں اچھی ہیں اور چند بُری کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ ہم اُس کو سکھا سکتے ہیں کہ وہ باورچی خانہ کے باہر رہا کرے۔ آواز دینے پر فوراً آجائے۔ لیکن اچھل اچھل کر گندے پنجوں سے کپڑوں کو خراب نہ کرے۔ وہ سُدھا ہوا کُتا ان سکھائی ہوئی باتوں کے خلاف عمل کرتا ہوا ہچکچائے گا۔ یہ ہچکچاہٹ صرف سزا کے ڈر سے ہی نہیں ہوگی۔ بلکہ اگر آپ اُس کو جھڑک ہی دیں گے تو بھی۔ وہ محسوس کرے گا کہ اُس نے بُرا کام کیا ہے۔

یہ ہم نے مانا کہ جنگلی جانوروں سے کتا مختلف ہے۔ اُسے انسان نے پالا اور سدھایا ہے۔ اس کے باوجود کتے کا اچھے اور بُرے میں تمیز کرنا ضرور حیرت انگیز ہے۔ جنگلی جانوروں میں بھی چند ایسے اُصول ہیں جن کو اُنھیں ماننا پڑتا ہے۔ بھیڑیوں کے ہر گروہ اور ہرنوں کے ہر غول کو اپنے اپنے سردار کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ اگر کوئی بھیڑیا یا ہرن اپنے گروہ کے سردار کے اشاروں پر عمل نہیں کرتا تو بہت ممکن ہے کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں مارا جائے۔ یعنی اگر وہ اس بات کو جو اس کے گروہ کے لئے ٹھیک ہے نہیں کرتا تو وہ ختم ہو جاتا ہے یہی اس کی سزا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگر کسی گروہ کا ممبر اپنے فرض کو صحیح طور پر سرانجام نہیں دیتا تو اس سے سارے گروہ کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔ اس لئے وہ جانور جو گروہ کے قوانین کو مانتے ہیں زندگی اور افزائش نسل کا زیادہ موقع حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے بچے بھی والدین کے قدم بقدم چل کر گروہ کے قوانین کو ماننے لگتے ہیں۔

چنانچہ جانوروں کے لئے وہی ٹھیک ہے جو ان کے گروہ یا غول کو زندہ رہنے میں مدد دے۔ اور وہ فعل جو ان کو خطرہ میں ڈالے بُرا ہے۔ مثال کے طور پر ہاتھی جنگل میں الگ الگ خاندانوں میں رہتے ہیں۔ جس طرح فوج اپنے گرد سپاہیوں کا پہرہ بٹھا دیتی ہے اسی طرح یہ ہاتھی بھی اپنے غول کے گرد ہاتھیوں کا پہرہ لگا دیتے ہیں تاکہ وہ وقت پر سب کو خطرے سے آگاہ کر دیں۔ اب اگر ان چوکیداروں میں سے کوئی سو جائے یا اِدھر اُدھر چلا جائے تو وہ ایسا فعل کر رہا ہو گا جسے اگر ہاتھی کی زبان ہوتی تو ضرور بُرا کہتا۔

نیکی اور بدی کا راز

اب ہم نیکی اور بدی کے معمّہ کو حل کرنے کے بہت نزدیک آ گئے ہیں

جب ایک ہی قسم کے جانور مل کر رہتے ہیں تو جنگ اور چارہ کی جستجو میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اس امداد باہمی کے باعث اُن کی طاقت کسی تربیت یافتہ فوج سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ گو ایک گھوڑا شخصی حیثیت سے چیتے کے مقابلہ میں بے بس ہی کیوں نہ ہو مگر جب یہ گھوڑا دوسرے بہت سے گھوڑوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر مقابلہ کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو ایسی حالت میں اُس پر کسی خونخوار سے خونخوار جانور کو بھی حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

آپ کو بوڑھے باپ اور اُس کے سات بیٹوں کا قصہ تو یاد ہوگا جو آپس میں ہمیشہ لڑتے رہتے تھے۔ اور کس طرح بوڑھے نے اُنھیں بتایا کہ میل میں ہی طاقت ہے۔ پہلے اکیلے سرکنڈے کو آسانی سے توڑ کر دکھایا۔ پھر بہت سے سرکنڈوں کو جمع کر کے ایک مٹھا بنایا جو تمام طاقت لگانے پر بھی ٹوٹ نہ سکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب جانور گروہ بنا کر رہتے ہیں تو اُنھیں آپس میں رواداری اور باہمی امداد کے اُصول پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔ وہ ہر بات میں مَن مانی نہیں کر سکتے کیونکہ اُنھیں بہت سی باتیں اپنی مرضی کے مطابق نہ کر کے گروہ کے مفاد کو مدنظر رکھ کر کرنا پڑتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ جانور جو اکیلا رہتا ہے حسبِ منشا، جو چاہے کرتا ہے۔ اُس کے ساتھ دوسرا اور کوئی نہیں ہے جس کا اسے لحاظ کرنا پڑے۔ لیکن شہد کی مکھی کو مکھیال میں چیونٹی کو اپنے بل میں جنگلی گھوڑوں کو اپنے غول میں۔ بھیڑیوں کو اپنے گروہ میں اور ہاتھی کو اپنے خاندان میں رہ کر ایک دوسرے کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس طرح وہ ایسے کام کرتے ہیں جنھیں ہم انسانی زبان میں اچھے کام کہہ سکتے ہیں۔

جانوروں سے سبق

یہ جانتے ہوئے کہ ہمارا وکاس حیوانات سے ہی ہوا ہے اس بات سے

ہمیں کوئی تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ بہت سی باتیں جو حیوانی دُنیا میں ٹھیک ہیں ہماری دُنیا میں بھی صحیح ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کریں۔ اُنھیں خطرہ سے بچائیں۔ جانور بھی ایسا ہی کرتے ہیں جب گھونسلہ میں انڈوں سے بچے باہر نکل آتے ہیں تو اُن کے ماں باپ تمام دن کیڑے مکوڑے لا لاکر ان ننھے بچوں کے منہ میں بھرتے رہتے ہیں۔ اور اگر کوئی بلّی اُن کے گھونسلے کے پاس آنے کی جرأت کرتی ہے تو یہ اپنی چونچوں سے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے بچوں کی جانیں بچانے کی کوشش کرتے ہیں جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ماں باپ انھیں اُڑنا سکھاتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو سنبھال سکیں۔

شیر۔ چیتے۔ گھوڑے۔ ہرن۔ بندر اور تمام اعلیٰ اقسام کے جانوروں میں بچوں کی محبت اور پرورش کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے بچوں کی پرورش نہ کریں تو اُن کی نسلیں ہی ختم ہو جائیں۔ کیونکہ اُن کے بچے اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ طاقتور دشمن سے اپنی حفاظت کر سکیں۔

طاقتور جانور کمزور ساتھی کی مدد کرتے ہیں

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ طاقتور کو کمزور کی مدد کرنا چاہیئے۔ گو ایسے بھی جانور ہیں جو اپنے کمزور اور بیمار ساتھی کی پرواہ نہیں کرتے اور ان کو ان کے حال پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن ایسے جانور بھی ہیں جو ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بجّو دوسرے زخمی بجّو کو حفاظت کی جگہ لے جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اندھے چوہوں کو دوسرے چوہے خوراک

لا کر کھلاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ زخمی یا بیمار کتّے کو اس کے ساتھی چوگا لا کر کھلاتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ تندرست نہ ہو جائے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک زخمی نیولے کو اُس کا ساتھی اُٹھا کر لے گیا۔

جانور کیوں اچھّے کام کرتے ہیں؟

اگر مندرجہ بالا مثالوں سے آپ کی تسلّی نہیں ہوئی کہ جانور بھی بچّوں سے محبّت کرتے ہیں یا بے غرض اور ہمدرد ہوتے ہیں تو اس موضوع پر چند کتابیں پڑھنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی۔ سب سے بڑی بات جو ہم ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر جانوروں میں محبت اور دلیری نہ ہوتی تو وہ کبھی زندہ نہ رہ سکتے۔ اگر وہ ایک دوسرے سے مل کر کام نہ کرتے اور خطرے کے موقعہ پر ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیتے تو اُن کے خونخوار دشمن انھیں ختم کر دیتے۔

انسان بھی ایک گروہ پسند جانور ہے

جس طرح جنگلی جانور گروہ یا غول کی صورت میں اکٹھے ہو کر رہتے ہیں اُسی طرح انسان بھی گاؤں اور بستیوں میں مل کر رہنا پسند کرتا ہے جس طرح جنگلی جانوروں کو بجائے من مانی کرنے کے گروہ یا غول کے قوانین پر عمل کرنا پڑتا ہے اُسی طرح انسان جب سوسائٹی میں۔ یا مل کر رہنے لگتا ہے تو اپنی مرضی کے مطابق چلنے کے بدلے اُسے دوسروں کی خدمت اور مدد کرنا پڑتی ہے اُسے ایسے افعال سے بچنا پڑتا ہے جو دوسروں کے لئے نقصان دہ ہوں۔ اس کو بھی اپنے بچّوں کی پرورش کرنی پڑتی ہے۔ کمزور کی مدد اور دوسروں کی

حفاظت کے لئے جان پر کھیل جانا پڑتا ہے۔ اس لئے انسانوں کی دُنیا میں بھی دوسروں کی خدمت اور حفاظت کرنا اچھے کام ہیں۔ اور من مانی کارروائی کرنا۔ ملک یا قبیلہ کی زندگی میں حصّہ نہ لینا بُرے کام ہیں۔

چنانچہ اچھائی اور بُرائی یا نیکی وبدی کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب چند آدمی ایک جگہ مِل کر رہنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی جنگل میں اکیلا رہتا ہو جس سے اُس کے کاموں کا اثر سوائے اُس کے کسی دوسرے پر نہ پڑتا ہو تو وہاں نیکی اور بدی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کر سکتا ہے۔ کیونکہ اُسے کسی دوسرے کے مفاد کے متعلق نہیں سوچنا ہے۔ اُسے سچ اور جھوٹ کی پرواہ نہیں۔ اس لئے کہ وہاں کوئی دوسرا ایسا نہیں جسے کہ وہ دھوکا دے سکے۔ وہ چوری۔ قتل اور ظلم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے علاوہ وہاں کوئی اور ہے ہی نہیں چنانچہ اگر کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو آزادی سے جو چاہے کرے تو وہ جنگل میں رہنے والا اکیلا انسان ہی ہے۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اُسے کسی قانون یا حکم کی ضرورت نہیں۔ لیکن جیسے ہی کوئی دوسرا شخص اُس آدمی کے پاس آکر رہنے لگتا ہے تو تمام حالات بدل جاتے ہیں۔ اب وہ من مانی نہیں کر سکتا۔ اُسے دوسرے آدمی کا بھی خیال کرنا ہوگا اس کی مدد کرنی ہوگی تاکہ وہ بھی اس کا ساتھ دے سکے۔ دونوں کو آپس میں سچ بولنا پڑے گا جس سے ایک دوسرے پر اعتبار رہو۔ ایک دوسرے سے ہمدردی کرنی ہوگی تاکہ خلوص اور محبت بڑھے۔ جب ایک اپنا فرض ادا کرتا ہے تو دوسرے کو بھی فرض کی ادائیگی کا سبق دیتا ہے۔ پہلا شخص کہہ سکتا تھا کہ اُسے نووارد کے کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن اگر وہ ان اچھے کاموں کو نہ کرتا تو وہ دونوں آپس میں کبھی خوشی اور ہمدردی سے نہ رہ سکتے

یہ ہے نیکی اور بدی کا راز! نیکی اُن اصولوں کا نام ہے جو زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کے اکٹھا رہنے اور مل کر کام کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دیں چنانچہ اپنے لئے خوشی اور سکھ حاصل کرانے کے لئے جس دن لوگ آپس میں مل کر رہنے لگے اُسی دن انسان نے دھرم اور ادھرم، نیکی اور بدی گناہ اور ثواب وغیرہ الفاظ کی ایجاد کی۔ جن افعال سے جماعت کو فائدہ اور سکھ حاصل ہوتا ہے ان کو اچھا، دھرم اور کارِ ثواب کہا۔ اور جن کاموں سے جماعت کو نقصان ہوا اُن کو بُرا، ادھرم، گناہ وغیرہ کے نام سے یاد کیا۔

پتھر کے زمانہ میں نیکی اور بدی

اب ہم نیکی اور بدی کی کہانی پتھر کے زمانے کے بزرگوں سے شروع کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بزرگ مندرجہ بالا امثال والے شخص کی طرح اکیلے نہیں رہتے تھے۔ بے دُمے بندروں میں بھی (جو رشتہ میں انسان کے سب سے نزدیک ہیں) کئی کئی خاندان آپس میں مل کر رہتے ہیں۔ اسی طرح آجکل کے وحشی بھی (جو پتھر کے زمانے کے لوگوں سے بہت ملتے جلتے ہیں) گروہ بنا کر رہتے ہیں جنھیں ہم قبیلہ کہتے ہیں۔

بالفرض پتھر کے زمانہ میں بعض ماں باپ اپنے بچوں کی نگہداشت ایسے ڈھنگ سے نہیں کرتے جو اُس زمانے کے حالات کے مطابق ٹھیک تھا۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اُن کے بچے فاقوں مر جائیں یا کسی جانور کا لقمہ بن جائیں۔ اس لئے بڑے لوگ جنھوں نے اپنے بچوں کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کی اپنے پیچھے کوئی اولاد نہ چھوڑ سکے۔ اس کے برعکس وہ والدین جنھوں نے اپنے بچوں کی اچھی طرح حفاظت اور پرورش کی۔ اُن کو خطرہ سے بچنا

خوراک کی تلاش کرنا۔ اپنے لئے پناہ کی جگہ بنانا اور دشمن سے لڑنا سکھایا لازمی ہے کہ اُن کے بچوں کو زندہ رہنے اور بڑھنے کا زیادہ موقع ملے وہ بچے بھی بڑے ہو کر اپنی اولاد کی اُسی ڈھنگ سے پرورش کریں گے چنانچہ اچھے لوگوں کے بچے زندہ رہے اور برے آدمیوں کے بچے مرتے گئے اسی طرح وہ بچے جو کاہل نافرمانبردار اور لاپرواہ ہوں گے ضرور مصیبتوں کا شکار ہوتے رہے ہوں گے۔ کیونکہ اگر وہ شکار کی کھوج کرنا۔ پتھر کے کلہاڑے کا استعمال اور خطرے سے پہلے ہی آگاہ ہونا نہیں جانیں گے تو ان کا بڑا ہونا اور اپنی حفاظت خود کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔

زمانہ جنگ میں اچھا اور بُرا

پتھر کے زمانہ میں بہت سے خاندان گروہوں کی صُورت میں اکٹھے ہو کر ایک جگہ رہتے تھے تاکہ خوراک کی تلاش اور دشمنوں سے لڑنے میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ جس طرح ہر خاندان کے افراد کو اپنے بزرگ یعنی باپ یا دادا کا کہنا ماننا پڑتا تھا ویسے ہی تمام خاندانوں کے گروہ یعنی قبیلہ کا بھی ایک سردار ہوتا تھا۔ جو عام طور پر قبیلہ بھر میں سب سے بہادر اور ہوشیار ہوتا تھا۔ یہی سردار گروہ کے لئے قانون بناتا تھا۔ اور جو برے ہوتے تھے یا قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے اُنھیں سزا دیتا تھا۔

اگر آپ کو اپنے قدیم وحشی بزرگوں کی زندگی کا خاکہ دیکھنا ہے تو موجودہ زمانہ کے وحشیوں کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ افریقہ میں وحشیوں کے سینکڑوں قبیلے ہیں۔ ہر قبیلہ کا الگ الگ سردار ہے۔ اور اُن کے رسم و رواج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تقریباً یہ تمام قبیلے جنگ کے شوقین ہیں۔ جب انگریزوں نے

اس ملک پر قبضہ جمایا تو سب سے پہلے انہوں نے ان قبیلوں کو آپس میں لڑنے سے روکا۔ انگریزوں سے پہلے کوئی ایسا بڑا سردار نہ تھا جو تمام قبیلوں کا سردار ہوتا۔ اور انھیں آپس میں لڑنے سے روک سکتا۔

اس سے یقین ہو جاتا ہے کہ قدیم زمانہ میں ہمارے بزرگوں کے قبیلے بھی ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ اور ریڈ انڈین Red Indian کی طرح ایک دوسرے کے علاقوں پر حملہ کرتے ہوں گے۔ گو اُن میں بہت سے قبیلے لڑنا پسند نہ کرتے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی انہیں اپنی حفاظت کے لئے لڑنا ہی پڑتا ہو گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی خوبیاں تھیں جن کی بنا پر ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کو شکست دے سکتا تھا۔ آپ کہیں گے کہ جیتنے والے قبیلہ میں زیادہ تر سدھے ہوئے آدمی ہوتے ہوں گے۔ جو تیر و کمان یا پتھر کے ہتھیاروں کا بخوبی استعمال کر سکتے ہوں گے۔ گو یہ چیز بھی ٹھیک ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں اس کے علاوہ بھی بیسیوں ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر فتح حاصل کرتا ہے۔ اُن میں سے چند باتیں ہم نیچے درج کرتے ہیں۔ اور اُن کے سامنے اشارۃً وہ الفاظ بھی لکھ دیتے ہیں جن سے معلوم ہو جائے گا کہ اُن کا نیکی اور بدی سے کیا تعلق ہے۔

وہ لوگ جو اپنے سردار کا حکم مانتے ہیں اُن لوگوں کی نسبت جو اپنے سردار کا حکم نہیں مانتے، جنگ میں جیتنے کا زیادہ موقع رکھتے ہیں	فرمانبرداری
وہ قبیلہ جس کے تمام افراد سردار سے وفادار رہنے کی قسم کھاتے ہیں اس قبیلہ پر فتحیاب	وفاداری

ہو سکتے ہیں جس میں غدار بھی ہیں	
دلیر بزدلوں پر فتح پاتے ہیں۔	دلیری
وہ لوگ جو زیادہ عرصہ تک لڑ سکتے ہیں اور ہار ماننے کے لئے تیار نہیں عام طور پر اپنے سے زیادہ تعداد کے مقابلہ میں بھی جیت جاتے ہیں۔	استقلال اور قوت برداشت
وہ لوگ جو آپس میں مل کر محبت سے کام کرتے ہیں اُن لوگوں کے مقابلہ میں جو ایکدوسرے سے حسد کرتے ہیں جیتنے کا زیادہ موقع رکھتے ہیں	محبّت
جو لوگ ایک دوسرے کا اور سردار کا اعتبار کرسکتے ہیں ایسے لوگوں کی نسبت جن کو دھوکا دینے اور جھوٹ بولنے کی عادت ہے زیادہ اچھا لڑیں گے۔	دیانت داری اور سچ بولنا۔
جو سردار اپنے ساتھیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے اس کے ساتھی بھی مرتے دم تک اس کا ساتھ دیں گے۔ اور وہ سردار جو اپنے آدمیوں سے سختی اور بے رحمی سے پیش آئے گا اس کے ساتھی خطرے کے موقع پر اسے چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔	مہربانی
جو سپاہی فنونِ جنگ سیکھنے میں محنت کرتے ہیں ایسے سپاہیوں کو جو سست اور	تندہی اور سرگرمی

لاپرواہ ہیں ضرور شکست دیں گے

مندرجہ بالا چند وجوہ ہیں جن کے باعث ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر فتح پاتا ہے۔ ان باتوں سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی قبیلے کے آدمیوں کو اچھے کام ہی کیوں کرنا چاہئیں۔ اگر کسی قبیلے کے لوگ وفادار۔ بہادر۔ مستقل مزاج۔ دیانت دار۔ مہربان اور محنتی ہیں تو وہ ایسے قبیلے پر ضرور فتح حاصل کریں گے جو ان صفات سے خالی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو اچھے کام کرتے ہیں اُن لوگوں کے مقابلہ میں جو ایسا نہیں کرتے زندہ رہنے کا زیادہ موقع رکھتے ہیں۔ جس طرح قدرت اپنے قانون کے مطابق ایسے جانوروں کو چُن لیتی ہے جو اپنے بچوں کی نگہداشت کرتے ہیں اور گروہ یا غول کے قانون کو مانتے ہیں اُسی طرح وہ اچھے آدمیوں کے گروہ کو بھی چُن لیتی ہے۔

ظلم کیوں بُرا ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خونخوار جانوروں کو زندہ رہنے کا زیادہ موقع ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے جانوروں کو مار سکتے ہیں! ور انھیں آسانی سے کوئی نہیں مار سکتا۔ اگر یہ خیال صحیح ہوتا تو دُنیا میں کمزور اور بے ضرر جانوروں کی کثرتِ تعداد کی بجائے شیر اور چیتے جیسے خونخوار جانور ہی نظر آتے۔ مگر زیادہ تعداد ایسے جانوروں کی ہے جو مِلکر اپنی حفاظت کرتے ہیں مثلاً۔ ہرن گھوڑے اور دوسرے مویشی۔ اگر خونخواری ہی سب کچھ ہوتی تو آج سمندر میں گوشت خور مچھلیوں کے سوا کسی اور مچھلی کا نام ونشان تک نہ ہوتا لیکن اس کے برعکس خونخوار مچھلیوں کی بجائے بے ضرر مچھلیوں کے گروہ ہی زیادہ نظر آتے ہیں۔

یہی چیز ہم انسانوں میں بھی دیکھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ خونخوار اور بے رحم قبیلے ہی دُنیا میں زندہ رہیں اور فتوحات حاصل کریں۔ گو وہ کچھ عرصہ کے لئے دوسروں پر فتح حاصل کرلیں لیکن اُن کی خونخواری اور ظلم ہی دوسرے قبیلوں کا آپس میں مل کر اُن پر حملہ کرنے اور شکست دینے کا باعث بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ظالم قوم خود ہی اپنے دشمن پیدا کرلیتی ہے۔ جتنا ظلم کوئی قوم کرے گی اُتنا ہی اُس قوم کے دشمن آپس میں اتفاق کرکے اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس جو قوم رحمدل۔ بہادر اور انصاف پسند ہے وہ اپنے بہت سے دوست بنا لیتی ہے۔

زمانۂ امن میں اچھا اور بُرا

قدیم زمانہ میں جب کہ دُنیا کے کسی نہ کسی حصّہ میں جنگ ہوتی ہی رہتی تھی اس وقت اُن لوگوں کے علاوہ جو جنگ میں لڑتے رہتے تھے ایسے لوگ بھی تھے جو قتل وغارتگری کی بجائے دوسرے مفید کام کرتے تھے۔ بعض کاشتکاری کرتے تھے تو بعض مویشیوں کی دیکھ بھال اور پرورش۔ بعض کا کام جانوروں کی کھالوں اور درختوں کی چھالوں سے کپڑے تیار کرنا تھا۔ یہ لوگ آپس میں بیوپار کیا کرتے تھے۔

قدیم زمانے کا بیوپار آجکل کا سا نہ تھا۔ وہ روپیہ سے چیزوں کو خریدنے کی بجائے آپس میں چیزیں بدل لیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس وقت روپے کی ایجاد نہ ہوئی تھی۔ اگر لوہار کو جوتے کی ضرورت ہوتی تو وہ چمار کو لوہے کا اوزار دے کر جوتا لے لیتا تھا اور کسان کابُل بنا کر اُس سے اناج حاصل کرلیتا تھا۔ اس طرح آپس میں لین دین چلتا رہتا تھا۔ مگر جو بات ہم ذہن نشین کرانا

چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ جنگ اور امن دونوں حالتوں میں جو لوگ ٹھیک یا اچھا کام کرتے ہیں اچھے رہتے ہیں۔

بالفرض جو جوتا لوہار نے چمار سے اوزار کے بدلے میں لیا تھا (جس کے متعلق چمار نے کہا تھا کہ یہ جوتا نہایت ہی مضبوط ہے) استعمال کرنے پر خراب نکلے تو لوہار اُسے ضرور دھوکے باز کہے گا۔ آہستہ آہستہ تمام لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ فلاں چمار دیانت دار نہیں ہے۔ اور وہ اُس سے کسی قسم کا لین دین نہیں کریں گے۔

یہی حالت موجودہ تجارت کی بھی ہے۔ اگر کوئی تاجر دوسرے سوداگروں کو دھوکا دے تو ہوسکتا ہے کہ شروع میں وہ بازی لے جائے لیکن بالآخر تمام سوداگر اُس سے لین دین بند کر دیں گے۔ بعد میں چاہے وہ دیانت داری سے بھی کام کرنے کا وعدہ کرے مگر اُس کو وہ کامیابی دوبارہ مشکل سے ہی نصیب ہوگی۔

اس کے برعکس اُس شخص سے جو دیانت دار اور وعدہ کا سچّا ہے ہر شخص بیوپار کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

نیکی کیا ہے

نیکی وہ ہے جو لوگوں کے آپس میں مل کر رہنے اور تعلقات کو خوشگوار بنانے میں مدد دے۔ دوسرے الفاظ میں نیکی اُن اصولوں کا نام ہے جن پر عمل کر کے انسان ایک جگہ پیار اور محبت سے مل کر رہ سکتے ہیں۔ ان اصولوں کو سماجی اصول کہتے ہیں کیونکہ اُن کے بغیر سوسائیٹی قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ اُصول ضرورتِ وقت اور حالات کے مطابق بدلتے بھی

رہے ہیں۔ ہمیں خدا۔ ایشور، کسی دیوتا یا کسی مذہبی کتاب نے شروع میں نیک چلن بننے کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ جانداروں کے وکاس کی طرح ہماری اخلاقی صفات یا سماجی اصول بھی رفتہ رفتہ ترقی کرتے رہے ہیں۔ جیسے جیسے انسان زیادہ تہذیب یافتہ ہوتا گیا سماجی اصول بھی اعلیٰ اور مکمل ہوتے گئے۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ انسان کی بہتری اور بہبودی کے لئے نیکی کتنی ضروری ہے۔ صاحب علم و عقل تو اس چیز کو سمجھ کر اس پر عمل کر سکتا ہے۔ لیکن چھوٹے بچوں کو یہ سمجھانا کہ انھیں کچھ کام کیوں کرنا چاہیئے اور کچھ کام کیوں نہیں، بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے مجبوراً ماں باپ انھیں کہتے ہیں کہ انھیں ان کا حکم ماننا چاہیئے اور اگر وہ نہیں مانیں گے تو انھیں سزا ملے گی۔

وحشی اور جاہل بھی بہت سی باتوں میں بچوں ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ بالغ ہونے پر بھی بچوں کا سا دماغ رکھتے ہیں۔ اس لئے اُن کو اچھا کام کرنے کی ترغیب دینے کے لئے دوسرے ڈھنگ سے کام لیا گیا۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ جہالت سے ہی خوف اور ڈر پیدا ہوتا ہے۔ وحشی جاہل ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ڈرتے بھی بہت ہیں۔ وہ سب سے زیادہ اُن فرضی بھوت پریت اور دیوتاؤں سے خوف کھاتے ہیں جو انھیں ہر درخت۔ گھر۔ دریا اور پتھر میں بسیرا بنا کر رہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کسی قبیلہ کا سردار یہ چاہے کہ قبیلے والے اُس کا حکم مانیں تو اُن سے یہ کہنا ہی کافی ہوگا کہ وہ لوگ اگر سردار کا حکم نہ مانیں گے تو دیوتا اُن سے ناراض ہو جائیں گے۔ یہ دھمکی اُن پر موت کی دھمکی سے بھی زیادہ اثر کرے گی۔ دوزخ یا نرک کی کہانیاں اسی دھمکی کی تعبیریں ہیں۔

عام طور پر دوزخ کی کہانیوں میں آگ کو بڑا دخل ہے۔ تبت چونکہ سرد ملک ہے اور گرمیوں میں فقط سہ پہر کو ذرا سی گرمی ہوتی ہے۔ اس لئے تبت والوں کو کسی چیز کی شکایت ہے تو سردی کی۔ اگر اُن کو بتایا جاتا کہ دوزخ میں ہمیشہ آگ جلتی رہتی ہے تو وہ سمجھتے کہ وہاں بدن گرم کرنے میں کافی آرام ملے گا۔ اس خیال کو مدنظر رکھ کر تبت کے لاما (مذہبی پیشوا) عوام کو یہ تعلیم دیا کرتے ہیں کہ دوزخ میں سخت سردی ہوتی ہے۔ اس لئے تبت کے باشندے سردی کے ڈر کے مارے دوزخ میں جانا نہیں چاہتے۔

جس طرح بعض اوقات بچوں کو مٹھائی یا کھلونوں کا لالچ دے کر کسی کام کے کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اُسی طرح لوگوں سے مذہبی باتوں کو کرانے کے لئے اُنھیں دیوتا یا خدا کی طرف سے طرح طرح کے عیش و آرام کا لالچ دیا جاتا ہے۔ "بُرے کام کروگے تو مرنے کے بعد کرموں کے مطابق سانپ بچھو یا گدھا بنائے جاؤگے۔ اور اچھے کام کروگے تو دوبارہ آدمی کی جُون ملے گی یا نجات حاصل ہوگی"۔ یہ خدائی حکم بھی لوگوں سے نیک کام کرانے کے لئے ہی بنایا گیا تھا۔

ڈر اور لالچ کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جو لوگوں کو قبیلہ کے قانون یا اچھے کام کو کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور وہ ہے اُس قبیلہ یا فرقہ کے رسم و رواج کی طاقت۔

اچھے اور بُرے کام کرنیکا رواج

جنوبی امریکہ میں ایک قبیلہ ہے جن کی زبان میں "اچھا" یا "بُرا" کے ہم معنی کوئی الفاظ ہی نہیں ہیں۔ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ وہ فلاں کام

کیوں کرتے ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ "پاپا" یعنی یہ رواج ہے جس طرح
جنگلی گھوڑے اپنے گروہ کے رواج پر چلتے ہیں اُسی طرح یہ لوگ اپنے قبیلہ
کے رواج کو مانتے ہیں۔ یہ بات تو ظاہر ہی ہے کہ اگر کوئی قبیلہ خود کو دُنیا میں
زندہ رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ضروری ہے کہ اُس قبیلہ کے بعض رواجات
"اچھے" اور "ٹھیک" ہوں۔ مگر جاہل اس بات کو نہیں سمجھتا۔ وہ کسی کام کو صرف
اس لئے کرتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہمارا بھی ایسا ہی
حال ہے۔ عام طور پر ہم ایک ہی جیسے کپڑے پہنتے ہیں۔ کیونکہ ایسے کپڑے
پہننا رواج ہے۔ اگر کوئی ہندو ترکی ٹوپی پہن لے تو ہندو اس کو دیکھ کر نکتہ چینی
کریں گے۔ اسی طرح کوئی مسلمان سر پر چوٹی رکھ لے تو تمام مسلمان اُس سے
ناراض ہو جائیں گے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اُس نے ایک ایسی بات
کی ہے جس کا اس کے حلقہ میں رواج نہیں۔

چنانچہ خوف۔ لالچ اور رواج ہی وہ چیزیں ہیں جو جاہلوں کو کچھ باتوں
کے کرنے اور کچھ باتوں کے نہ کرنے سے روکتی ہیں۔ جب وحشی قبیلہ کے دیوتاؤں
کو ماننے لگے تو وہ اُن کے غضب سے ڈرتے تھے۔ ہر قبیلہ اپنے دیوتا کو بڑے
باپ کی جگہ سمجھتا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ دیوتا خاندان یا قبیلہ کے رسم و رواج کو نہ
ماننے پر ناراض ہوگا اور سزا دے گا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کا عقیدہ ہو گیا کہ وہ قانون
جن کی وہ پیروی کرتے ہیں قبیلہ کے دیوتا کے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ اُن کا
یہ خیال نہیں تھا کہ یہ ضرورت اور حالات کے مطابق خود بخود پیدا ہوتے گئے
بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ قانون ویسے کے ویسے آسمان سے زمین پر اترے ہیں۔

عیسائیوں کے دس احکام۔ ویدوں کے منتر اور قرآن کی آیتیں اس
چیز کی نہایت عمدہ مثالیں ہیں۔ بائبل میں درج ہے کہ موسیٰ اسے خود اپنے

کہا کہ وہ کوہ طور پر جائے۔ وہاں وہ اُسے پتھر کے ٹکڑے دے گا جن پر اُس نے قوانین اور احکام کندہ کر دیئے ہیں تاکہ اُنھیں موسیٰ لوگوں کو بتائے۔ اس سے آگے درج ہے کہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کو اکٹھا کیا۔ اور اُن سے کہا کہ یہ وہ احکام ہیں جنھیں یہوواہ نے بھیجا ہے کہ ہم اُنھیں تسلیم کریں اور اُن پر عمل کریں۔ ظاہر ہے کہ اسرائیلی اگر یہ سمجھیں کہ وہ احکام اُن کے دیوتا نے بھیجے ہیں تو اُن کو وہ زیادہ پابندی سے عمل میں لانے کی کوشش کریں گے بہ نسبت اس کے کہ اُن کو معلوم ہو کہ وہ احکام انسان نے بتائے ہیں۔

اگر آپ کسی قبیلہ کے سردار یا مذہبی رہنما ہوں تو آپ کے لئے یہ بہت ہی آسان ہوگا کہ آپ اپنے محکوموں یا پیرؤوں سے کہیں کہ جو کچھ قبیلہ کا دیوتا کہتا ہے اُسے اُنھیں ضرور ماننا چاہیئے۔ اور اگر وہ نہیں مانیں گے تو دیوتا اُن پر بیماری اور طرح طرح کی مصیبتیں بھیج کر سزا دے گا۔ یہ چیز اُن پر زیادہ اثر کرے گی اور وہ کہنے کے مطابق چلنے لگیں گے۔

چنانچہ قبیلہ کے سردار اور مذہبی رہنما عام لوگوں سے یہ کہکر اپنا مقصد پورا کرتے تھے کہ اُنھیں دیوتا وہ سب باتیں بتا دیتے ہیں جنھیں وہ چاہتے ہیں کہ لوگ مانیں۔ اُنھیں یہ باتیں دیوتا بادلوں کی گرج سے۔ خواب کی حالت میں۔ غیبی آواز یا فرشتوں کے ذریعہ بتلاتے رہتے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہ کو خدا یا دیوتا نے تخت پر بٹھایا ہے۔ اور وہ زمین پر اس کی طرف سے حکومت کرتا ہے۔ اسی لئے بادشاہ کا حکم اور خدا کا حکم ایک ہی سمجھا جاتا تھا۔ جو شخص بادشاہ کے فرمان کو نہیں مانتا تھا اُسے کہا جاتا تھا کہ وہ خدا کے حکم کی نافرمانی کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں سے جو کچھ خدائی ٹھیکیداروں نے کہا اُسے وہ بے چون و چرا ماننے کے

عادی ہو گئے۔ اور اُن باتوں پر یقین رکھنا ہی خدا کو خوش کرنا ہو گیا۔

انسان کو مذہب کے پُراسرار فلسفہ اور آئندہ زندگی کے سُکھوں کے وعدوں سے کمال تسکین ہوئی۔ اور اُس نے مذہب کو سچا رفیق سمجھکر اس کی صحبت میں زندگی گذارنا پسند کیا۔ اُس وقت کے بزرگوں نے سمجھایا کہ انسان کے سر پر جتنی مصیبتیں آتی ہیں وہ کسی نہ کسی مذہبی قانون کی خلاف ورزی سے ہی آتی ہیں۔ زندگی کو خوش حال بنانے اور قدرت کی طاقتوں پر حکمرانی کرنے کے لئے مذہب کی امداد لازمی ہے۔ غرض کہ اس طرح دُنیا میں مدت دراز تک مذہب کا ڈنکا بجتا رہا۔ اور دُنیا کی تمام آبادی بخوشی مذہب اور مذہب کے ٹھیکیداروں کے قدموں میں سربجود رہی۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مذہب کے رتبہ اور اختیارات کا ہمیشہ جائز استعمال نہیں ہوا۔ کم عقلوں اور تنگ ذہن والوں نے مذہبی جنون کے بس میں ہو کر اور دُنیا پرستوں نے مذہب کی چادر اوڑھ کر بے گناہوں کے سر پر طرح طرح کے ظلم و ستم کئے ہیں اگر خدا کے کسی بندے نے ذرا بھی آزاد خیالی سے کام لیا تو دھرم کے اِن ٹھیکیداروں نے اس کا سر قلم کرا دیا۔ یا کھال کھچوا دی۔ ظالم سے ظالم عیاش اور بد کردار بادشاہوں کو بھی خدا کا نائب یا چھوٹے خدا کا درجہ انہی مذہب والوں نے دیا ہے۔ انسان نے انسان پر مذہب اور خدا کے نام پر وہ وہ ظلم کئے ہیں کہ جن کا ذکر تک رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔

کسی عالم نے سچ کہا ہے کہ "جو غلط عقائد بد نصیب نسل انسانی پر لعنت برساتے رہے ہیں اور جن سے عاشقان صداقت کو نفرت کرنی چاہیے اُن میں سے کسی عقیدے سے اس قدر مضر نتائج پیدا نہیں ہوئے جتنے کہ مذہبی

کتابوں کو غلطیوں سے پاک مان لینے سے ہوتے ہیں۔ یہ عقیدہ نقصان اور دھوکا دینے والا ہے۔ یہ عقیدہ ایک خراب زمین ہے جس میں مذہبی ٹھیکیداروں کے فریب کا وہ خوفناک اور زہریلا درخت اُگتا اور پھلتا پھولتا ہے جس نے انسانی تاریخ کے ہر صفحے کو ذلت، مصیبت، خون اور آگ سے آلودہ اور داغدار کر دیا ہے۔"

"ٹھیک" ٹھیک ہے

اصل میں مذہب کا منشا صرف یہی ہے کہ جاہلوں کو ایسے کام کرنے کی ترغیب دی جائے جس سے سوسائٹی کا نظام قائم رہے۔ اس کے لئے انھیں دیوتا یا خدا کی طرف سے طرح طرح کی تکلیفوں کی دھمکیاں اور عیش و آرام کا لالچ دیا گیا ہے۔

لیکن آج جب کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اچھے کام اس لئے اچھے ہیں کہ وہ آپس میں مل کر رہنے اور سچی خوشی کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ انھیں اِن سماجی قوانین کو منوانے کے لئے کسی دوسری دُنیا کی فرضی، خوفناک سزاؤں سے ڈرانے یا عیش و آرام کے لالچ دینے کی ضرورت نہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ برے کام کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جو لوگ اچھے کام کرتے ہیں بہ نسبت اُن لوگوں کے زیادہ خوش ہیں جو خود غرض، بے رحم دھوکے باز اور کاہل ہیں۔ اس لئے وہ بُری عادتوں کو چھوڑنے اور رحمدل سچے بے غرض اور محنتی بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

س کے علاوہ لوگ صرف اس لئے ہی اچھے کام نہیں کرتے کہ وہ خوش رہیں۔ یہ تو ایک طرح سے بدلہ ملنے کی خواہش ہے جب ایک

سپاہی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میدانِ کارزار سے اپنے زخمی ساتھی کو بڑی دقتوں کا سامنا کر کے بچا کر لاتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ لوگ اُس کی تعریف کریں گے یا اُسے انعام ملے گا۔ بلکہ اُس کی رحمدلی اور دلیری اُسے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ چاہے کوئی اس کے اس فعل کو دیکھے یا نہ دیکھے وہ پھر بھی اپنا فرض پورا کرتا ہے۔ کیونکہ نیکی بذاتِ خود ہی اپنا انعام ہے۔
دوزخ اور جنت کے خوف اور لالچ سے انسان کو نیک چلن بنانا بچوں کو ہوا یا بھوت کے خوف سے ڈرا کر چپ کرانے کے برابر ہے بچے بھوت یا ہوّے سے تب تک ہی ڈرتے ہیں جب تک کہ وہ چھوٹے ہوتے ہیں۔ بڑے ہو کر بھوت یا ہوّے کی جب انہیں حقیقت معلوم ہو جاتی ہے تو یہ چیزیں انہیں ڈرانے کیلئے کچھ کام نہیں دیتیں۔ دوزخ کے خوف اور جنت کے لالچ سے انسان کو نیک چلن بنانا انسان کی بزرگی کو گھٹا دینا ہے۔

اخلاق یا سماجی اصولوں کی بنیاد کسی مذہب پر نہیں ہے۔ اخلاق کی پیدائش انسان کی معلومات تجربات اور قدرتی قوانین کے ذریعہ ہوئی ہے۔ قدرتی انتخاب کے قانون نے ہی انسان کو نیک چلن بننے کی تعلیم دی ہے۔

مذہب انسانیت

فطرت انقلاب پسند ہے۔ عالم کے ہر حصہ میں ہر گھڑی۔ ہر لمحہ برابر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے نیبولا سے سورج بنا۔ سورج سے کئی سیارے نکلے۔ ہمارے سیارے پر زندگی نمودار ہوئی جو ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی بالآخر انسان کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ آج انسان نے فطرت کی سینکڑوں قوتوں کو تسخیر کر لیا ہے۔ اور ان کو اپنی اغراض کے لئے استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ ذہنی اعتبار سے انسان برابر بلند ہو رہا ہے۔ ہم اپنے آبا و اجداد سے عقلی اعتبار سے بدرجہا بلند ہیں۔ ہمارے حیوانی بزرگوں کو چھوڑئیے اُن میں اور ہم میں نمایاں فرق موجود ہی ہے۔ بلکہ ہم ابتدائی انسانوں سے بھی

بلند تر ہیں۔ اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ہم نشو ونما کر رہے ہیں۔ اخلاقی اور مذہبی تصورات ابتدا میں کنبہ۔ پھر خاندان اور پھر قبیلہ کے رشتہ پر مبنی رہے۔ انسانوں کے دیوتا قبیلوں کے سرداروں کی طرح آپس میں لڑتے تھے۔ اُن میں بغض وعداوت بھی تھا۔ اس کے بعد ہمارا مذہبی اور اخلاقی تصوّر اور بلند ہوا اور ہم ایک خدا میں یقین کرنے لگے۔ مگر ابھی تک ہمارے اعلیٰ مذاہب میں بھی ایک سے زیادہ دیوتاؤں کا تصوّر موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہر مذہب کا خدا بھی جُدا جُدا قسم کا ہے۔ مسلمانوں کا خدا عربی بولتا ہے اور مسلمانوں سے ہی خوش ہے۔ اس کے نزدیک جو مسلمان نہیں وہ کافر ہے اور دوزخ کا ایندھن ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کا خدا عبرانی میں بات چیت کرتا ہے اور عیسائیوں سے ہی خوش ہے۔ اس کے برعکس آریوں کے پرماتما کی زبان سنسکرت ہے۔ وہ آریوں کے سوا سب کو ملیچھ سمجھتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ہر مذہب کا الگ الگ خدا ہے جو اپنے ہی مذہب کی طرفداری کرتا ہے۔ ہر مذہب اپنے کو سچا اور دوسروں کو جھوٹا جانتا ہے۔

ایک حقیقت کے متلاشی کو یہ دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ مختلف اقسام کے یہ مذاہب مختلف ماحول اور حالات میں رہنے والوں کی ذہنی کیفیات کا عکس ہی ہیں۔ کیونکہ نسل انسانی مختلف قوموں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس لئے ہر قوم کے دیوتا اُس قوم کے گردوپیش کے حالات کے مطابق ہی وجود میں آئے علم اور تجربہ کی ترقی اور دوسری وجوہات کے باعث رفتہ رفتہ بہت سے دیوتاؤں کی جگہ کئی قومیں ایک بڑے دیوتا کو ماننے لگیں۔ یہ بڑے دیوتا بھی قومیت اور تنگ نظری کے دائرے سے آزاد نہ ہو سکے۔ ہر فرقہ یا مذہب اپنے خدا کو ہی سچا خدا سمجھنے لگا۔ اس تنگ نظری کی ایک بڑی وجہ

تھی ۔ اُس زمانہ میں بار برداری کے ذرائع بہت ہی محدود تھے ۔ ایک قوم کے افراد دوسری اقوام سے زیادہ واقف نہ تھے ۔ ہر قوم دوسری تمام قوموں کو اپنا دشمن سمجھتی تھی ۔ لازمی تھا کہ ہر قوم کا مذہب اور خدا بھی اس تنگ نظری سے رنگا ہوا ہو۔

کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے ۔ سب انسان بھائی بھائی ہیں ایک ہی خدا کے بندے ہیں ۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مذہب والوں نے بے شمار آدمیوں کا خون بہایا ہے ۔ اتنے لوگوں کا قتل کیا ہے کہ اگر ان کی ہڈیوں کو اکٹھا کیا جائے تو دُنیا کے اونچے سے اونچے پہاڑ سے بھی اونچا مینار بنایا جا سکتا ہے ۔ رب العالمین کہنے والوں نے اپنے رویہ سے ہمیشہ یہ ثابت کیا ہے کہ وہ رب المسلمین ہے ۔ اسی طرح جگت پتا کے بھگتوں کے برتاؤ سے ظاہر ہے کہ وہ مُنہ سے جگت پتا کہہ کر بھی دل میں اسے ہندو پتا ہی مانتے ہیں۔

ہمارے دل و دماغ پر بھی مذہب کا بہت بُرا اثر پڑا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ مذہب انسان کو ایکتا کے بندھن میں باندھتا ہے ۔ معمولی آفت پڑنے پر مذہب کی پکار سُننے پر ایک ہی مذہب کے ماننے والے اکٹھے ہو جاتے ہیں ایک مذہبی کے نزدیک اس کا ہم مذہب بھائی سب سے پیارا ہوتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مذہب اس سے کہیں زیادہ نفرت اور بھید پیدا کرتا ہے ۔ ایک عیسائی کی کل ہمدردی صرف عیسائیوں تک ہی محدود ہوتی ہے ۔ اور وہ بھی اُن عیسائیوں تک جو اس کے فرقہ کے ہمنوا ہوں ۔ مسلمان ہندو کو کُتے سے بھی بدتر سمجھتا ہے ۔ اور ہندو دوسرے مذاہب کے لوگوں کو نہ صرف نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھتا ہے بلکہ اُن کا چھُوا ہوا پانی

تک نہیں پیتا۔ والٹیر Voltaire نے سچ کہا ہے کہ "خدا سے پیار کرنا اور انسان سے نفرت ہی شاید مذاہب کے اصولوں کا نچوڑ ہے"

کسی خاص زمانہ۔ ملک یا گروہ کے لوگوں کا قائم کیا ہوا اخلاقی معیار اور مذہب ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ انسان کا مذہب۔ سماجی اصول اور اس کا ضمیر سب انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے رہے ہیں۔ جن افعال کو انسانی تہذیب کی پہلی سیڑھی پر چڑھتے وقت اچھا اور نیک خیال کرتا تھا۔ انہی کو تھوڑا اونچا چڑھ جانے پر نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ کل جو باتیں اچھی سمجھی جاتی تھیں اور سماج کی ضروریات کو پورا کرتی تھیں، آج وہی انسان کی ترقی کی راہ میں روڑا بن گئی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر آن بدلنے والی مخلوق کے لئے ایک ایسا قانون وضع نہیں کیا جاسکتا جو ہر زمانے۔ ہر صدی اور ارتقار کی ہر منزل کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں اور پیشواؤں کے صدیوں پیشتر بنائے ہوئے احکام۔ اصول اور مذاہب ممکن ہے کہ اُس زمانے کی ضروریات کو پورا کرتے ہوں لیکن موجودہ زمانے میں اُن کی بہت سی باتیں ہمارے لئے وبالِ جان ہوگئی ہیں۔

اس لئے آج ہمیں ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ ہم انسانی زندگی میں سے مذہب کو خارج کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ہماری خواہش ہے کہ مذہب بھی دوسری چیزوں کی طرح ترقی کرتا رہے۔ مذہب بھی علم و عقل اور تجربہ کا ساتھ دے۔ تمام زندگی میں ارتقا ہو رہا ہے۔ ہمارے تمدن۔ مذہب اور اخلاق کو بھی اس ارتقار کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ اب

مذہب میں بھی ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس کو انسان کے حق میں زحمت کی بجائے رحمت بنا دینا چاہیئے۔ روحوں اور بھوتوں کے خوف سے نکل کر انسان دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگا۔ ذہنی ارتقاء کے ساتھ انسان بہت سے دیوتاؤں کی بجائے ایک دیوتا کا پرستار بن گیا۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بھی دکھا آئے ہیں یہ توحید پرستی قومیت اور فرقہ پرستی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ہر قوم اور ملک اپنا الگ الگ خدا لئے ہوئے ہے۔ اس لئے ہمیں زندگی اور ارتقاء کا ساتھ دیتے ہوئے ایسے خدا کا تخیل اپنے سامنے رکھنا ہے۔ جو تمام نسل انسانی کا خدا ہو۔ جس کی پرستش ہر قوم۔ مذہب اور نسل کا انسان کر سکے ہمیں ایسے خدا کی ضرورت ہے جو تمام انسانوں کا خدا ہو۔ اور کسی قوم یا کسی خاص شخص سے لگاؤ نہ رکھتا ہو۔ جو کوئی خاص زبان نہ بولتا ہو۔ بلکہ دل کی زبان میں ہر شخص سے باتیں کر لیتا ہو۔ کسی خاص مذہب کا دلدادہ نہ ہو۔ ضرورت ہے ہمیں ایسے خدا کی جو سب کا خدا ہو۔ وہ خدا یا مذاہب جو انسان کو مذہب کے ناطے نفرت کرنا سکھاتے ہوں۔ جو کافر و مومن۔ آریہ و ملیچھ کی تمیز کرنا اپنا طرۂ امتیاز رکھتے ہوں۔ ہمیں ایسے مذاہب اور خداؤں کی ضرورت نہیں۔

خدا کی پیدا کردہ تمام مخلوق آپس میں ایک دوسرے کی بھائی بھائی ہے۔ ان میں باہم کسی قسم کی تمیز نہیں۔ انسانیت کا یہ تصور ہمیں وہ معیار دیدیتا ہے جس پر ہم ہر تمدن اور ہر مذہب کو پرکھ سکتے ہیں موجودہ تمام قسم کے تمدن اور مذاہب اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اس لئے ہمیں ضرورت ہے ایسے مذہب اور تمدن کی جو انسانیت کو مساوی تسلیم کرے۔ جو انسان کو صحیح معنوں میں مساوات کے درجے تک پہنچا دے۔ زمانہ کی بدلتی ہوئی ضروریات اور ترقی کے ساتھ خود بھی بدلتا رہے۔ اور وہ ہے

مذہب انسانیت۔ مذہب انسانیت ہندو مسلمان۔ ذات پات ہم قوم غیر قوم وغیرہ کی چھوٹی تمیز کو اُڑا کر سب کو انسانیت کا درجہ دیتا ہے۔ مذہب انسانیت کا خدا سب کا خدا ہے۔ آزادی۔ مساوات۔ اخوت۔ اور ہمدردی اس کے چار ارکان ہیں۔ اور ہر وہ بات جو عقل اور سائنس کی کسوٹی پر صحیح ثابت ہو اُسے ماننا اُس کا عقیدہ ہے۔



مذہب انسانیت کا پیغام ہر انسان کے نام

" یہ عالم ایک جان اور ایک روح ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا نہ اس میں سے کچھ نکالا جا سکتا ہے اور نہ اس میں کچھ بڑھایا ہی جا سکتا ہے۔ اس لئے جو مذہب یا سیاسی فلسفہ فرقہ بندی کا پرچار کرتا اور اپنے فرقہ کے لوگوں کے علاوہ دوسروں سے بے اتفاقی کا سلوک روا رکھنا سکھاتا ہے۔ وہ خودکشی کا سبق دیتا ہے۔

اے انسان! قوم۔ مذہب۔ فرقہ اور ملک کے تعصبات کو مٹا کر تمام انسانیت کو ایک مشترکہ لڑی میں پرو کر اس کی قسمت کو بھی مشترکہ بنا دے دُنیا ایک شاندار پھیلاؤ ہے۔ زندگی ایک نہایت دلچسپ تجربہ ہے۔ لے تو بے بنیاد قیاسی جنت اور جہنم کے لالچ اور خوف سے غمگین اور بدمزہ مت بنا۔ تو ہم پرستی کی تاریک وادی سے نکل کر دلیل اور عقل کی روشن پہاڑی پر چڑھ جا۔ جہاں آفتاب علم لمحہ بہ لمحہ روشن تر ہوتا جاتا ہے جس کی روشنی میں الجھنیں سُلجھتی ہیں اور دل کو سکون ملتا ہے۔

قدرت بڑی امیر ہے۔ اس کے خزانوں میں کبھی
نہ ختم ہونے والی دولت نہاں ہے۔ یہ دولت
سب کے مشترکہ استعمال کے لئے ہے۔
اس لئے جو کوئی غریب اور ذلیل رہنا خدا
کی مرضی سمجھتا ہے وہ اپنی اور
خدا کی توہین کرتا ہے"۔
محبّت سے محبّت۔ نفرت
سے نفرت اور ضد سے
ضد پیدا ہوتی ہے۔ اس
لئے تو محبت کر۔
تاکہ دنیا میں
محبّت کا راج ہو"

(ماخوذ از رسالہ
"تربیت لاہی")

تمام شد!

"لامذہب"

ایک سچّی اور دردناک کہانی

مصنفہ ڈاکٹر پریم ناتھ

ہمارے سماج کے کٹّر پن اور تنگدلی کی زندہ مثال! ایک آزاد خیال کو (جس نے کسی دوسرے مذہب کی خاتون سے شادی کر لی تھی) کس طرح ہزاروں مصیبتوں اور آفتوں کا سامنا کرنا پڑا! مصنف نے یہ سچّی کہانی نہایت ہی دردناک اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کی ہے۔ یہ کتاب نئے خیالات کی حامل اور عالمگیر انسانی مذہب کی علمبردار ہے۔

عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی ہے۔



موت کی حقیقت

باتصویر

مصنفہ ڈاکٹر پریم ناتھ

موت کیا ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کیا رُوح لافانی ہے؟ ہر مذہب اور فلسفہ نے ان سوالات کا جواب اپنے اپنے طور پر دیا ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سائنس بھی موت کے متعلق اپنی الگ رائے رکھتی ہے۔ یہ رائے ہزاروں مشاہدات اور تجربات کے بعد ہی قائم کی گئی ہے۔ اس کتاب میں موت کی حقیقت پر سائنٹفک اور مدلل بحث کی گئی ہے مضامین کو سمجھانے کے لئے جگہ بہ جگہ تصاویر اور نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔

زیر ترتیب

